تعلیم و تربیت
نومبر 1989ء

اُنچاسواں سال ۔ آٹھواں شمارہ

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر :	عبدالسلام
ایڈیٹر :	ظہیر سلام
منیجر / اسسٹنٹ ایڈیٹرز :	مقبول انور داؤدی ڈاکٹر عبدالرؤف
ایسوسی ایٹ ایڈیٹر :	سید لخت
اسسٹنٹ ایڈیٹر :	محمد اقبال ثاقب
آرٹ ڈائریکٹر :	محمود حسن رُومی
سرکولیشن منیجر :	الطاف احمد
ایڈورٹائزنگ منیجر :	مبشر علی خان
ڈسٹری بیوشن منیجر :	شہزاد اصغر
اکاؤنٹس منیجر :	محمد انور بھٹی
جنرل منیجر پروڈکشن :	ایم جاوید خان
منیجر پرنٹنگ :	فاروق عالم
سرکولیشن اسسٹنٹ :	محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
پبلشر : ظہیر سلام
پرنٹر : عبدالسلام

شعبہ ادارت و اشتہارات
32۔ شارع بن بادیس (ایمپرس روڈ) لاہور
فون: 226819-320592

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
60۔ شاہراہ قائدِ اعظم لاہور
فون :- 97-301196

راولپنڈی آفس
277۔ پشاور روڈ
فون :- 64273-63503

کراچی آفس
مہران ہاؤس ۔ مین کلفٹن روڈ
فون :- 537730

1989

قیمت فی پرچہ 8/0 روپے

سرورق : عمران علی شان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السّلام علیکم

ہمیں ہر روز اپنے ساتھیوں کے سینکڑوں خط موصول ہوتے ہیں، جن میں ہمیں طرح طرح کے مشورے دیے جاتے ہیں اور تاکید کی جاتی ہے کہ اِن پر ضرور عمل کیا جائے ۔ بعض ساتھی کہتے ہیں کہ بس کہانیاں ہی چھاپا کیجیے ۔ خشک سائنسی اور معلُوماتی مضمونوں سے تو ہم اِسکول میں بور ہوتے رہتے ہیں۔ بعض اصرار کرتے ہیں کہ معلوماتی مضمون زیادہ سے زیادہ شائع کیا کیجیے ۔ اِن سے ہمارے علم میں اِضافہ ہوتا ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ تصویریں کم کر دیں تو بعض زور دیتے ہیں کہ تصویریں اور زیادہ کر دیں ۔

ہم سوچ رہے تھے کہ کسے خوش کریں اور کسے ناخوش کہ ایک پُرانی کہانی یاد آگئی، جو یُونان کے ایک کہانی کار "ایسپ" نے دو ہزار سال پہلے کہی تھی ۔ کہانی کُچھ یُوں ہے:

ایک کسان اور اُس کا لڑکا گدھا لے کر منڈی جا رہے تھے ۔ دونوں پیدل چل رہے تھے، اور ظاہر ہے گدھا بھی پیدل ہی چل رہا تھا۔ راستے میں ایک آدمی مِلا ۔ اُس نے کسان سے کہا "ارے میاں، معلُوم ہوتا ہے تُم عقل سے بھی پیدل ہو۔ اسی لیے، اچھی بھلی سواری ہوتے ہوئے ، پیدل چل رہے ہو۔ خُود گدھے پر بیٹھنا نہیں چاہتے تو لڑکے ہی کو بٹھا دو۔"

کِسان نے اس شخص کا مشورہ مان لیا اور لڑکے کو گدھے پر بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد دُوسرا آدمی مِلا ۔ اُس نے لڑکے سے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے! باپ پیدل چل رہا ہے اور بیٹا گدھے پر بیٹھا ہے ۔" لڑکا بُہت شرمندہ ہُوا ۔ اُس نے باپ کو گدھے پر بٹھا دیا اور خُود پیدل چلنے لگا۔

ابھی تھوڑی ہی دُور گئے ہوں گے کہ تیسرا آدمی مِلا۔ وہ بولا "بڑے میاں، تم بھی کتنے خُود غرض ہو۔ خُود گدھے پر سوار ہو اور معصوم بچّہ پیدل چل رہا ہے ۔" کسان نے لڑکے کو بھی گدھے پر بٹھا لیا۔ اور آگے گئے تو چوتھا آدمی مِلا۔ اُس نے کہا "ہائے! ہائے! تم بھی کتنے بے رحم ہو! بے چارے گدھے پر دونوں چڑھے بیٹھے ہو۔ اِس غریب بے زبان پر ذرا ترس نہیں آتا؟"

اب کسان لوگوں کی باتوں سے تنگ آ گیا تھا۔ اُس نے گدھے کو زمین پر لِٹایا، اُس کی ٹانگوں میں لاٹھی باندھی ۔ لاٹھی کا ایک سرا کسان نے اپنے کندھے پر رکھا اور دُوسرا سِرا لڑکے نے اپنے کندھے پر، اور دونوں اُسے اُٹھا کر چل پڑے ۔ راستے میں ایک ندی پڑتی تھی ۔ ندی پر لکڑی کا ایک تنگ سا پُل بنا ہُوا تھا۔ کسان اور اُس کا لڑکا گدھے کو کندھوں پر اُٹھائے پُل پر سے گزرے تو گدھے نے ، گھبرا کر، دولتّیاں چلانی شُروع کر دیں۔ باپ بیٹا اُسے سنبھال نہ سکے اور وہ شڑاپ سے ندی میں گر پڑا۔

اِس کہانی کا اخلاقی نتیجہ یہ نکلا کہ "آپ ہر شخص کو خُوش نہیں کر سکتے۔" البتّہ کوشش کریں تو زیادہ تر لوگوں کو خُوش کر سکتے ہیں۔ ہم بھی اِسی بات کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ کے فضل و کرم سے اپنی اس کوشش میں کام یاب ہیں۔

ہمارے آرٹ ڈائریکٹر جناب محمود حسن رُومی ایک ماہ سے علیل تھے۔ اس لیے اِس شمارے میں تصویری کہانی "شیر شاہ سُوری" نہیں چھپ سکی ۔ اب خُدا کے فضل سے وہ تن دُرست ہو گئے ہیں ۔ اگلے مہینے سے یہ سلسلہ شُروع کر دیا جائے گا ۔ اِن شاءاللہ۔

ایڈیٹر

فہرست مضامین

نعت
پروفیسر خالد بزمی

وہ ایک تتلی تھی

میرزا ادیب

پرویز اور فراست جبیں بھائی بہن تھے۔ ان کا کوئی اور بھائی اور بہن نہیں تھی ۔ اس لئے دونوں کو ایک دوسرے سے بڑی محبّت اور پیار تھا۔ دونوں ایک ساتھ اسکول جاتے تھے، کلاس میں ایک ہی ڈیسک پر بیٹھتے تھے اور ایک ساتھ ہی گھر واپس آتے تھے۔

فراست کی ایک سہیلی فرخندہ امتحان میں اوّل آئی تو اُس نے اپنی کام یابی کی خُوشی میں اپنے کچھ عزیزوں اور سہیلیوں کو چائے پر بُلایا ۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کی پیاری سہیلی فراست اپنے بھائی کے بغیر اُس کے ہاں اوّل تو آئے گی ہی نہیں، اور آئی بھی تو خوشی سے نہیں آئے گی ۔ اس لئے اس نے دونوں کو دعوت دے دی ۔ بڑی پُر تکلُّف دعوت تھی۔ شام تک سب کھانے پینے، قہقہے لگانے اور باتیں کرنے میں مصرُوف رہے۔ پھر پرویز اور فراست کے سِوا سارے بچّے اپنے اپنے گھر چلے گئے ۔

فرخندہ کی کوٹھی کا باغ بڑا خُوب صُورت تھا ۔ پرویز اور فراست جب بھی اس کے یہاں آتے، اس باغ میں تھوڑی دیر کے لیے ضرور گھومتے پھرتے ۔ اُس شام بھی وہ دونوں فرخندہ کے ساتھ باغ میں جا نکلے۔

شام کا اندھیرا ابھی پھیلا نہیں تھا۔ مغربی آسمان پر سورج آہستہ آہستہ غُروب ہو رہا تھا۔ اس کی شفق میں ڈوبی ہُوئی کرنیں بڑی خُوب صُورت لگ رہی تھیں ۔ شفق میں گِھرا سورج یُوں دکھائی دیتا تھا جیسے سُرخ پانی کی جھیل میں سُرخ گلاب کا پُھول تیر رہا ہو ۔

فرخندہ ، پرویز اور فراست ٹہلتے ہوئے باغ کے ایک گوشے میں پہنچ گئے جہاں رنگا رنگ پُھول پودوں کی شاخوں پر کِھلے ہوئے بڑے پیارے لگتے تھے۔ یکایک فراست بول اُٹھی "ہائے ! تتلیاں! کتنی پیاری ہیں!"

"جی چاہتا ہے ان کو پکڑ لیں" پرویز نے کہا۔

فرخندہ جو خود بھی ان تتلیوں کو دیکھ رہی تھی، کہنے لگی "تتلی پکڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے ۔"

"اگر میں ایک تتلی پکڑ لوں تو؟" پرویز بولا۔

"ذرا پکڑ کر دِکھاؤ تو سہی ۔"

فرخندہ خوب جانتی تھی کہ پرویز جتنی چاہے کوشش کر لے، ناکام ہی رہے گا۔ اس لئے وہ مُسکرا رہی تھی۔

بار بار بھاگنے کی وجہ سے پرویز اور فراست پسینے میں شرابور ہو گئے تھے لیکن اس کوشش سے باز نہیں آئے تھے ۔ فرخندہ ایک طرف کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی اور انہیں اس ناکام کوشش سے باز رہنے کی تلقین کر رہی تھی ۔

پرویز ایک ایسی تتلی کے پیچھے بھاگ رہا تھا جو بے حد خوب صُورت تھی۔ یہ تتلی کبھی ایک پیڑ پر بیٹھتی تھی اور پھر جلد ہی وہاں سے اُڑ کر دوسرے پودے کی شاخوں میں گم ہو جاتی تھی ۔ پھر یکایک پرویز کے مُنہ سے ایک خوشی بھرا نعرہ نکل گیا ۔ اس نے وہ

بیچاری تتلی اپنی مٹھی میں بند کر لی تھی۔

"چھوڑ دو اسے" فرخندہ نے کہا "خدا کے لئے چھوڑ دو۔ بے چاری مر جائے گی۔"

"نہیں۔ میں نہیں چھوڑوں گا۔ اتنی کوشش کی ہے۔ میں اسے گھر لے جاؤں گا۔"

"کیا کرو گے گھر لے جا کر؟" فرخندہ نے پوچھا۔

"کیا کروں گا؟ ... اسے ایک کتاب میں بند کر دوں گا۔"

"وہاں یہ زندہ نہیں رہے گی" فرخندہ نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟ اس کے پروں کو تو کچھ نہیں ہوگا نا۔"

"ہاں، پر تو ویسے کے ویسے چمکتے رہیں گے" فراست نے بھائی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

فرخندہ کو پرویز اور فراست کی یہ حرکت پسند نہیں تھی۔ لیکن اُن کو خفا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے خاموش ہو گئی۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ تتلی کو گھر کیسے لے جایا جائے۔ آخر فراست کو اس مسئلے کا حل سوجھ گیا۔ بولی "اسے رومال میں بند کر دیتے ہیں۔ گھر جا کر کتاب کے اندر رکھ دیں گے۔" اور انہوں نے تتلی رومال میں بند کر دی۔ اِس کے بعد دونوں بھائی بہن گھر چلے گئے۔

فراست کی تجویز یہ تھی کہ ابھی رُومال میز کے اوپر رکھ دیتے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد تتلی کو کسی اچھی سی کتاب میں رکھ دیں گے۔

"ٹھیک ہے" پرویز کو یہ تجویز بڑی پسند آئی۔ اُس نے رُومال میز کے اوپر رکھ دیا اور دونوں کمرے سے باہر آگئے۔

وہ ہاتھ مُنہ دھو کر کھانے کے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ پرویز کی نظر اپنے ابُو جان پر پڑی جو اپنے کمرے میں کُرسی پر سر جُھکائے بیٹھے تھے۔ دونوں بچے جب بھی کسی تقریب میں جاتے تھے تو اپنے ابُو کو ضرور اطلاع دیتے تھے کہ وہ واپس آگئے ہیں۔ وُہ کمرے کے اندر گئے اور ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُن کے ابُو کے سامنے ایک کتاب کھلی پڑی ہے اور وہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی ماتھے پر رکھے کتاب کے صفحوں کو دیکھ رہے ہیں۔

"ابا جان!" پرویز نے آہستہ سے کہا۔ لیکن اُنہوں نے سر اٹھا کر اُن کی طرف دیکھا تک نہیں، بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ غم گین سے لگتے تھے۔ اب کے فراست نے ذرا آگے بڑھ کر آواز دی تو اُنہوں نے کہا "ہُوں"۔

"ابُو جی" پرویز نے ذرا بلند آواز سے پکارا۔

"آگئے؟" ابا جی نے صرف یہی ایک لفظ کہا۔

"کیا بات ہے؟" فراست کے لہجے میں حیرت تھی۔

"دعوت مزے دار تھی؟" باپ نے سوال کیا۔

"جی، بڑی اچھی تھی۔ ... آپ کیا سوچ رہے ہیں؟" فراست بولی۔

"وہ ... بیٹی، ایک کتاب ڈھونڈنے اِدھر آیا تھا کہ اِس کتاب پر نظر پڑ گئی اور ایک واقعہ یاد آگیا ...."

"کون سا واقعہ، ابُو جی؟" فراست نے پوچھا۔

"سُننا چاہتے ہو؟"

دونوں کے مُنہ سے یک وقت "ہاں" نکلا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

وہ کُرسیوں پر بیٹھ گئے تو اُن کے ابا جی کہنے لگے "یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے جب میری عمر پرویز جتنی ہوگی۔ مجھے باغوں میں گھومنے پھرنے کا بڑا شوق تھا۔ اُس زمانے میں ہمارا گھر جس جگہ واقع تھا، وہاں قریب ہی ایک بڑا شان دار باغ بھی تھا۔"

"جیسا فرخندہ کا ہے" فراست بول اُٹھی۔

پرویز کو غصہ آگیا ۔ بولا "فراست ، بیچ میں مت بولو ۔ جب بزرگ بات کریں تو بچّوں کو نہیں بولنا چاہیے ۔ اچھا ابا جی، پھر کیا ہُوا ؟"

"پھر یہ ہُوا کہ ایک دن چھٹی کے روز میں باغ میں گیا تو ایک تتلی بڑی پیاری لگی۔ مجھے میرے ایک دوست نے بتایا تھا کہ تتلی کو پکڑ کر کتاب میں رکھ دیں تو اُس کے پروں کے رنگ ویسے کے ویسے رہتے ہیں۔ میں نے وہ تتلی پکڑلی اور اسے اپنے کمرے میں لا کر ایک کتاب میں رکھ دیا ۔ دوسرے روز میں نے کتاب کھولی تو وہ بے چاری مر چکی تھی ۔ اس کے پروں کے رنگ کتاب کے صفحوں پر لگ گئے تھے۔ میں نے یہ واقعہ گھر میں کسی کو بھی نہ بتایا۔ کتاب الماری کے اندر رکھ دی ۔ ۔ ۔"

پرویز اور فراست بڑے غور سے باپ کے چہرے کو تک رہے تھے جو اُداس نظر آتا تھا۔

ابا جی کہنے لگے "اُس رات میں سونے کو تو سو گیا مگر جلد ہی آنکھ کُھل گئی ۔ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی ہے۔ میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا ۔ روشن دان سے چاند کی کرنیں اندر آرہی تھیں ۔ ان کی روشنی میں دروازے کے قریب ایک سایہ سا نظر آیا اور پھر ایسا لگا جیسے میرے قریب ہی کوئی بچّہ رو رہا ہے ۔ میں ڈر کر امّی کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے سارا واقعہ سُنا تو بولیں:

"ناصر بیٹا، یہ تم نے بہت بُرا کیا جو اُس تتلی کو مار ڈالا ۔ ہمیں تتلی دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے ۔ تم نے تتلی کو مار کر اس خوشی کو مار ڈالا ہے ۔"

میں زار و قطار رونے لگا۔ امّی نے تسلّی دی اور مجھ سے وعدہ لیا کہ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا ۔ وہ دن اور آج کا دن، میں تتلیوں کو دیکھتا تو ہوں، انہیں پکڑتا ہرگز نہیں ۔ ۔ ۔ اُس تتلی کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کرنے کا مجھے آج تک افسوس ہے۔"

یہ کہ کر وہ ذرا رکے ۔ پھر بولے "آج یہ کتاب نظر آگئی ۔ اسی کے اندر میں نے وہ تتلی رکھی تھی ۔ اِسے دیکھا تو وہ سارا واقعہ یاد آگیا ۔ یہاں کتاب میں اُس بے چاری تتلی کے مُرجھائے پروں کا ایک حصّہ رہ گیا ہے ۔ یہ دیکھو۔"

پرویز اور فراست نے دیکھا۔ ان کے ابا جی نے سچ کہا تھا۔ ٹُوٹے ہوئے پروں کے مُرجھائے ہوئے رنگ بھی محسوس ہوتے تھے۔

"چلو ، اب کھانے کے کمرے میں۔" یہ کہ کر ابا جی اُٹھ بیٹھے ۔
پرویز اور فراست نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ طے کر لیا تھا۔ فراست بولی "ابا جی، ہم ابھی آتے ہیں" اور یہ کہ کر دونوں تیزی سے اپنے کمرے میں آئے ۔ پرویز نے رومال اٹھایا ۔

"زندہ ہے!" پرویز نے خوشی سے نعرہ مارا۔

"سچ؟"

"ہاں ، ہاں۔ دیکھ لو ۔"

پرویز رومال اٹھائے کھڑکی کے پاس گیا اور پھر رومال کی گرہ کھول دی ۔ فضا میں رنگوں کی ایک چھوٹی سی دُنیا دکھائی دی اور پھر غائب ہوگئی ۔ اس کے بعد دونوں خوش خوش کھانے کے کمرے کی طرف چلے گئے ۔

پچھلی سیٹ

نیل کنول

پھٹ پھٹ، گھرر گھرر کی ہول ناک آوازیں سُن کر ہمارا وہ سارا لُطف رفو چکر ہو گیا جو ہم رضائی میں گُھسے چُھٹّی کے دِن کا اٹھا رہے تھے۔ ہماری جگہ کوئی اور ہوتا تو یہی سمجھتا کہ شاید کوئی بہت بڑا طُوفان آ رہا ہے۔ مگر ہم تو اِن آوازوں کے عادی ہو چکے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ یہ خوف ناک آوازیں بھائی جان کی کار کی ہیں۔

جی ہاں، بھائی جان کی کار سے ہم ہی نہیں، سارا مُحلّہ اچھی طرح واقِف ہے۔ قصّہ کچھ یُوں ہے کہ بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد بھائی جان نے ابّا جان اور چند رِشتے داروں سے پیسے لے کر بابا آدم کے زمانے کی ایک سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی۔ اب محترمہ روز صُبح کو سوئے ہوئے لوگوں کو اپنی بھیانک آواز سے جگاتی ہیں اور شام کو دُنیا کی خاک چھان کر واپس آتی ہیں۔ محلّے کے کُتّوں کو اچھا خاصا شغل ہاتھ آ جاتا ہے۔

ہاں تو، جب ہماری نیند اِن مُحترمہ کی کان پھاڑ آوازوں سے جامِ شہادت نوش کر گئی تو ہم نے سوچا کہ چلو، نیند تو غارت ہو ہی گئی ہے، کیوں نہ باہر جا کر معلوم کیا جائے کہ آخر یہ اِتنی دیر سے گلا پھاڑ پھاڑ کر کیوں چلّا رہی ہیں! یہ سوچ کر ہم باہر نِکلے تو دیکھا کہ بھائی جان جُھنجھلائے ہوئے اپنی چہیتی گاڑی کو اِسٹارٹ کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔

"پتا نہیں" اُنہوں نے بونٹ کھولتے ہوئے کہا "کم بخت اِسٹارٹ کیوں نہیں ہو رہی!"

"ڈِکی کھول کر دیکھیں" ہم نے جلتی پر تیل ڈالا "کہیں وہاں کوئی خرابی نہ ہو۔"

"چُپ!" بھائی جان غُصّے سے بولے "میں تو تُمہارے بھلے کی سوچ رہا تھا، اور تُم مذاق اُڑا رہی ہو"۔

"ایں!" ہم تقریباً اُچھل پڑے "یعنی اِن مُحترمہ سے ہمیں بھی کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"

"بے وقوف مت بنو۔ آج تُمہاری چُھٹّی ہے۔ سوچا تھا، تُمہیں لمبی سی سیر کرائیں گے"۔

"یا الٰہی مدد!" ہم سر تھام کر بیٹھ گئے "بھائی جان، خُدا کے لیے ایسی ہول ناک خبریں نہ سُنایا کریں۔ ہمیں پُورے لاہور کا پیدل چکّر لگانا منظور ہے، مگر اِس گاڑی میں سیر! توبہ! توبہ!"

مگر بھائی جان کے آگے بھلا کسی کی کب چلی ہے۔ زبردستی ہمیں اُس ہیبت ناک ڈبّے میں ٹُھونس دیا اور پھر تقریباً ایک گھنٹے بعد اُسے اِسٹارٹ کرنے میں کام یاب ہو گئے۔ کار شور مچاتی، تھر تھر کانپتی باہر نکلی تو ہم نے دِل ہی دِل میں اپنی خیریّت اور سلامتی کی دُعائیں مانگنی شروع کر دیں۔ بھائی جان نے بڑے فخر سے ہماری طرف دیکھا اور مُسکرا کر بولے:

"دیکھا، کیسی چلتی ہے؟ ہوائی جہاز ہے، ہوائی جہاز۔ میں نے پُوری کی پُوری پر محنت بھی تو بہُت کی ہے"۔

"پُوری کی پُوری پر؟" ہم نے سر اُٹھا کر اُوپر دیکھا، جہاں چھت غائب تھی۔

"اوہو بھئی!" بھائی جان بولے "چھت کی فِکر مت کرو۔ وہ

یہ کہہ کر اُنہوں نے دروازے کو پچھلی سیٹ پر ڈال دیا اور خُود اُچک کر دوبارہ کار میں بیٹھ گئے۔ لیکن ہم ابھی تک باہر کھڑے اپنی پسلیاں گِن رہے تھے ۔

"اب کس چیز کا اِنتظار ہے؟" بھائی جان نے پُوچھا۔

"اُس وقت کا جب ساری کی ساری گاڑی پچھلی سیٹ پر ہوگی" ہم نے جھلّا کر کہا ۔

بھائی جان ہماری بات سُنی اَن سُنی کر کے کار اِسٹارٹ کرنے میں مصرُوف رہے، مگر وہ تو مُردوں سے شرط لگا کر سو گئی تھی۔ ہِلنے کا نام ہی نہ لیتی تھی ۔ جب کافی دیر ہو گئی تو بھائی جان نے بے بسی سے ہمیں دیکھا اور بولے "نیل، پلیز، دھکّا لگاؤ"۔

ہم نے کہا "پہلے اِسے کسی کھائی یا چٹان پر کھڑا کریں۔"

"اچھا" وہ بولے "چلو، تم اِسے اِسٹارٹ کرو۔ میں دھکّا لگاتا ہوں"۔

اُنہوں نے پیچھے جا کر دھکّا لگانا شرع کیا اور کار آہستہ آہستہ رِینگنے لگی ۔ لیکن کافی راستہ طے کرنے کے بعد بھی اِسٹارٹ نہ ہوئی ۔ ہمیں یہ خُوشی تھی کہ چلو، اِس طرح گھر پہنچ جائیں گے، لیکن خُدا خُدا کر کے اس اڑیل گدھی نے قسم توڑی اور ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ اسٹارٹ ہو گئی۔

ہم نے خُوش ہو کر پیچھے کی طرف دیکھا تو بھائی جان غائب! جلدی سے بریک لگائے اور پیچھے گردن موڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ دو پولیس والے بھائی جان کو مَین ہول میں سے نکال رہے ہیں۔ وہ کیچڑ میں لِتھڑے ہوئے بھائی جان کو اُٹھا کر ہمارے پاس لائے اور بڑے اخلاق سے بولے:

"مِس، اِن کا کیا کریں؟"

"اِنہیں فی الحال پچھلی سیٹ پر ڈال دیجیے" ہم نے اِطمینان کی سانس لے کر کہا ۔
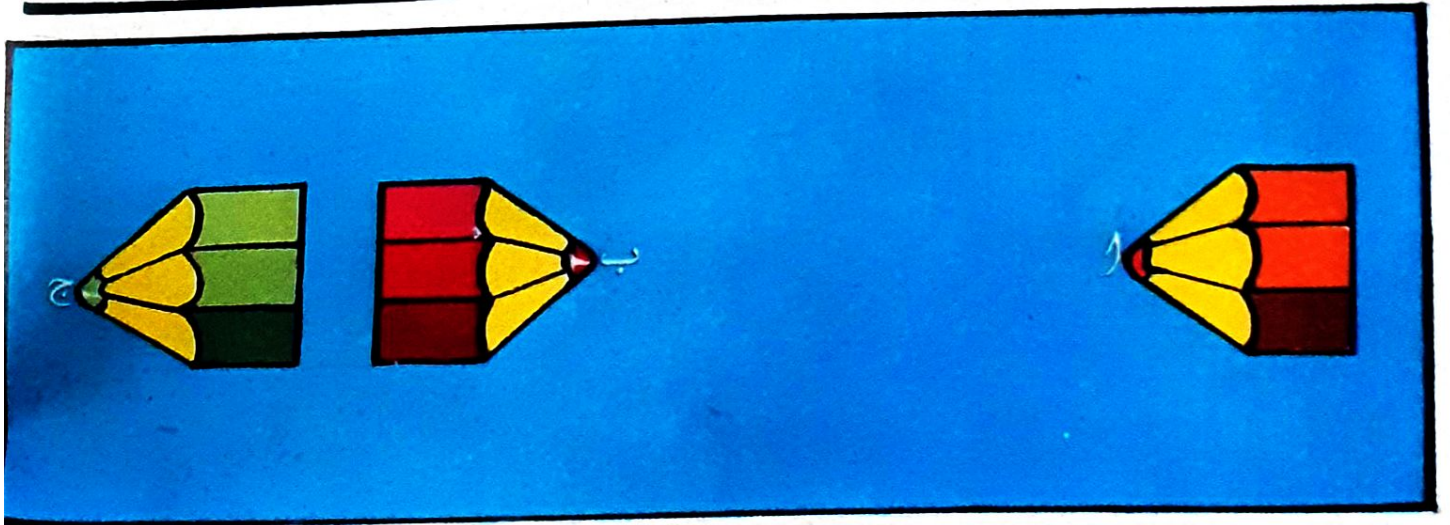
کون سا فاصلہ زیادہ ہے؟

• اِن پنسلوں کو غور سے دیکھیے، اور پھر بتائیے کہ پنسل الف اور پنسل ب کا درمیانی فاصلہ زیادہ ہے یا پنسل ب اور پنسل ج کا؟ آپ کی نظر آپ کو دھوکا دے سکتی ہے۔ اس لیے پیمانے سے (نوک سے نوک تک) ناپ کر یقین کر لیجیے۔

غیبی اِنسان

اشرف نوشاہی

بوائز سیکنڈری اِسکول میں چُھٹی کی گھنٹی بجتے ہی لڑکوں کے غول گیٹ کی طرف دوڑ پڑے تھے لیکن وہ تینوں لڑکے بڑے آرام سے گیٹ کی طرف جا رہے تھے ۔ وہ تینوں نویں جماعت میں پڑھتے تھے اور ان کے نام قمر ، مسعود اور خلیل تھے ۔ گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے وہ آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے ۔

"کیوں مسعود ، تمہارا کیا خیال ہے ؟ خلیل نے پوچھا۔

"کِس بارے میں؟" مسعود نے سوال کیا۔

"اس بارے میں جو آج کیمسٹری کے سر نے بتائی" خلیل بولا۔

"بھئی، میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں" مسعود نے کہا "ابھی تو مجھے نویں میں آئے اور کیمسٹری پڑھتے ہوئے صرف دو مہینے ہوئے ہیں"۔

"اور کیمسٹری بھی کون سی" قمر نے لُقمہ دیا "ابتدائی کیمسٹری۔"

"پھر بھی ۔ کچھ تو سوچا ہو گا؟" خلیل اُس کی رائے جاننا چاہتا تھا۔

"چھوڑو یار۔ کوئی اور بات کرو ۔ کہاں ہمارا علم اور کہاں سر سلمان کا علم" مسعود اُس کے اِصرار سے تنگ آ گیا۔

"چلو ہمارا علم اُن سے کم سہی ۔ پھر بھی ہم ان کے شاگرد تو ہیں" خلیل اب تک اپنی بات پہ اڑا ہوا تھا ۔

"تو کیا اُن کے شاگرد ہونے کی وجہ سے ہمارے سینگ نکل آئے ہیں؟" مسعود کی بجائے قمر کی آواز آئی۔

"تم سے کون بات کر رہا ہے" خلیل جو مسعود کی وجہ سے بے زار تھا، بے چارے قمر پر برس پڑا۔

"میں بھی تم سے نہیں، مسعود سے بات کر رہا ہوں" قمر نے ترکی بہ تُرکی جواب دیا ۔

"اچھا تو یہ بات ہے" یہ کہہ کر خلیل قمر کی طرف لپکا۔ لگتا تھا لڑنے پر تُل گیا ہے۔

"ارے ! ارے !" مسعود نے خلیل کو روک لیا "خلیل بھائی، تم بھی عجیب شے ہو۔ یا تو خود کو سائنس دان سمجھنے لگتے ہو یا پھر بُرے لڑکوں کی طرح لڑنے لگتے ہو"۔

"اوہ ! آئی ایم سوری قمر" خلیل کو اپنی غلطی کا اِحساس ہو گیا "دراصل میں بڑی شِدّت سے سر سلمان کی بات پر غور کر رہا ہوں"۔

"تم چھوٹی شِدّت سے کسی بات پہ غور نہیں کر سکتے؟" قمر بولا لیکن اس بار خلیل نے غُصّے سے آنکھیں نکالنے کے بجائے ہونٹوں کو حرکت دی اور مسکرا دیا۔

"آخر ایسی کیا خاص بات انہوں نے کہہ دی؟" مسعود نے کہا ۔

"ہائیں! تو کیا تمہیں نہیں معلوم؟" قمر اور خلیل کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا ۔

"واقعی ، مجھے نہیں معلوم" مسعود نے اِعتراف کیا۔

"افسوس ، میں بھینس کے آگے بین بجا رہا تھا" خلیل نے کہا۔

"حال آں کہ تُمہیں بھینسے کے آگے بین بجانا چاہئیے تھی" قمر نے جُملہ کسا۔

"قمر!" خلیل نے قمر کے جُملے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"جی حضور؟" قمر آداب بجالایا۔

"مسعود کو بتاؤ سر سلمان نے کیا کہا تھا" خلیل نے اس کی گردن دبوچ کر کہا۔

"بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں" قمر کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ وہ خلیل کے مقابلے میں کم زور تھا۔ "لیکن پہلے میری گردن ---" خلیل نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ قمر اُچھل کر مسعود کے پیچھے ہو گیا تاکہ خلیل دوبارہ اس پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ پھر بولا"؟ یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ انہوں نے کیا کہا تھا" اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

"سمجھ میں نہیں آتا ، اتنی اہم بات تم دونوں نے کیوں نہیں سُنی!" خلیل نے افسوس کا اِظہار کیا۔

قمر بولا "سیدھی سی بات ہے۔ اللہ نے ہمیں دو کان دیئے ہیں۔ ہم ایسی باتیں ایک کان سے سُن کر دُوسرے سے نکال دیا کرتے ہیں۔"

"کبھی اپنی ٹر ٹر بند بھی کیا کرو" مسعود نے کہا "سچّی بات تو یہ ہے کہ اِس وقت میں اور قمر دونوں کُھسر پُھسر کر رہے تھے اُن کی بات نہیں سُن سکے۔ اب تم بتا دو تو اچھا ہے۔"

"ابھی نہیں" شام کو ہاکی گراؤنڈ میں"۔

"ٹھیک ہے" مسعود اور قمر دونوں بولے۔

باقی وقت خاموشی سے گزر گیا۔ اور تینوں اپنے اپنے گھر پہنچ گئے۔ ان کے گھر یوں تو ایک ہی علاقے میں تھے لیکن ان میں تھوڑا بہت فاصلہ تھا۔

شام کو تینوں ہاکی گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔ وہ یہاں روزانہ آتے تھے۔ ہاکی کھیلنے نہیں، ہاکی دیکھنے۔ ہاکی گراؤنڈ میں بڑے بڑے کھلاڑی پریکٹس کیا کرتے تھے۔ سب کھلاڑیوں سے ان کی دوستی ہو گئی تھی۔ کئی دفعہ ان کھلاڑیوں نے انہیں بھی کھیلنے کی دعوت دی تھی لیکن انہیں ہاکی کھیلنے سے کوئی دِل چسپی نہ تھی۔ ان کا پسندیدہ مشغلہ اگر کوئی تھا تو وہ تھا سائیکلنگ۔ وہ سائیکلوں پر ہی یہاں آتے تھے۔

"ہاں اب بتاؤ سر سلمان نے کیا کہا تھا؟" قمر بھی اب سنجیدہ تھا۔ چُھٹّی کے بعد سے وہ اسی سسپنس میں مبتلا رہا تھا کہ ایسی کیا خاص بات ہو سکتی ہے۔

"سر سلمان نے کہا تھا" خلیل نے کہنا شروع کیا "کہ وہ ایک اہم سائنسی تجربہ کر رہے ہیں۔۔"

"چھوڑو یار یہ کیا بات ہوئی" مسعود نے بُرا سا مُنہ بنایا "اتنی سی بات کے لیے تم نے اب تک ہمیں پریشان کیے رکھا۔ وہ اہم تجربہ کر رہے ہیں تو کریں ، ہمیں کیا؟"

"بات تو پوری کرنے دو" خلیل نے بِھک منگوں کے سے انداز میں کہا۔

"جی ضرور پُوری کرنے دو" قمر نے حسبِ عادت لُقمہ دیا۔

"سر سلمان نے یہ بھی کہا تھا کہ انہیں اِس تجربے کے لیے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔"

"ہماری مدد کی!" مسعود حیران رہ گیا۔

"ہاں ہماری مدد کی" خلیل بولا "انہوں نے کہا تھا کہ اب تک تو وہ اکیلے ہی کام کرتے رہے ہیں، لیکن آئندہ انہیں تین مددگاروں کی ضرورت ہوگی اور وہ مددگار قمر، مسعود اور خلیل ہوں گے۔"

خلیل کی بات صحیح نکلی۔ اگلی صبح جب وہ اِسکول گئے تو ہاف ٹائم میں سر سلمان نے ان تینوں کو لیبارٹری میں بُلا کر اپنے تجربے کے بارے میں بتایا۔ وہ ایک انوکھا اور اہم تجربہ کر رہے تھے جس میں بڑی حد تک کامیابی ہو چکی تھی۔ بس اب چند اور تجربات کرنا باقی تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب ہو جاتے۔ قمر، مسعود اور خلیل سے اُنہوں کہا کہ ایک گھنٹے کا جو ہاف ٹائم ہوتا ہے ، اس دوران اِدھر اُدھر ٹہلنے کے بجائے لیبارٹری میں آکر اُن کی مدد کیا کریں۔

اگلے دن سے اُنہوں نے سر سلمان کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ شام کو وہ ہاکی گراؤنڈ میں ملتے تو سر سلمان اور تجربات ہی کی باتیں کرتے اسی طرح تقریباً دو مہینے گزر گئے۔ سر سلمان کا تجربہ اب آخری مرحلے میں آگیا تھا، اور انہوں نے اپنے تینوں شاگردوں سے کہا تھا کہ کل اُن کی کامیابی کا دن ہو گا۔ اُس شام جب وہ ہاکی گراؤنڈ میں جمع ہوئے تو ان کا تجسّس اپنی انتہا پر تھا۔

"خلیل بھائی" قمر نے کہا "کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ دو مہینے ہو گئے ہیں، ایک بات بھی میرے پلّے نہیں پڑی۔"

"چلو پتا چل جائے گا" خلیل نے کہا۔

اُس رات ان تینوں کو بڑی مشکل سے نیند آئی۔ اگلی صبح ہاف ٹائم سے پہلے کسی بھی پیریڈ میں وہ ڈھنگ سے پڑھ نہ سکے۔ ہاف ٹائم کی گھنٹی بجتے ہی وہ تینوں لیبارٹری میں موجود تھے۔ لیکن یہ کیا؟ سر سلمان غائب تھے!

"آخر سر سلمان کہاں جا سکتے ہیں؟" قمر سوچنے لگا "آج تو اُن کی کام یابی کا دن تھا۔"

یہ کافی بڑی لیبارٹری تھی اور اس میں بے شمار کیمیائی آلات اور اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود یہ ممکن نہ تھا کہ سر سلمان وہاں ہوتے اور انہیں نہ ملتے۔ ان کے سوا یہاں اور کوئی نہیں آتا تھا۔

"آؤ، اُن کے آفس میں دیکھتے ہیں" مسعود کو خیال آیا۔

وہ تینوں آفس میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں سر سلمان مطالعہ کیا کرتے تھے۔

"وہ یہاں بھی نہیں ہیں" قمر بولا۔

"ممکن ہے انہیں کسی نے اِغوا کر لیا ہو" خلیل نے خیال ظاہر کیا۔

"ایسے نیک خیالات تم اپنے ذہن ہی میں رہنے دو مُنہ سے نہ نکالو" قمر نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

"لیکن عموماً" بڑے سائنسدانوں کو ۔۔۔" خلیل کہنے لگا۔

"اغوا کر لیا جاتا ہے" مسعود نے بات پوری کی "چھوڑو یار یہ جاسوسی ناول نہیں، حقیقی زندگی ہے"۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ وہ کہاں ہیں؟" خلیل نے زچ ہو کر کہا۔

"وہ یہاں ہیں" قمر زور سے اُچھلا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کاغذ تھا۔ خلیل اور مسعود دوڑ کر اس کے پاس پہنچے۔

"یہ کاغذ مجھے میز پر پڑا ملا ہے" قمر کی سانس حیرت کے مارے پھول رہی تھی "اور اس میں لکھا ہے"۔۔۔ آگے وہ بول نہ سکا اس لیے کہ تینوں کی نظریں کاغذ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ جوں جوں کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جا رہی تھیں۔ لکھا تھا!

"قمر، مسعود اور خالد

مجھے افسوس ہے، آج میں تمہیں نہیں مل سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنے مشن میں کام یاب ہو گیا ہوں بہت عرصے سے میں کوئی ایسی دھات بنانے کی کوشش کر رہا تھا جس سے ٹکرا کر روشنی مُنعکس نہ ہو سکے۔ آخر کار میں نے ایک ایسا کیمیائی عُنصر دریافت کر لیا ہے جس میں سے روشنی گزر جاتی ہے اور مُنعکِس نہیں ہوتی۔ اس وقت میں نے اِسی عنصر کی بنی ہوئی چادر اوڑھ رکھی ہے، اس لیے تم مجھے نہیں دیکھ سکتے حال آں کہ میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہوں!"

"نہیں!" تینوں ایک ساتھ چیخ اُٹھے۔

"یہ سچ ہے" اُنہیں سر سلمان کی آواز اُس کرسی کی طرف سے

آئی جس پر وہ بیٹھے ہوئے تھے ۔ کرسی نظر آ رہی تھی لیکن اُس پر بیٹھنے والا غائب تھا!

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" خلیل نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔ اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ یہی حال باقی دونوں کا تھا ۔

"یہ ایسے ہو سکتا ہے کہ" سر سلمان کی دھیمی آواز آئی "ہم جو بھی چیز دیکھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ روشنی کی شعاعیں اُس سے ٹکرا کر ہماری آنکھ میں آتی ہیں۔ اگر روشنی کی شعاعیں ٹکرا کر نہ آئیں تو ہم کوئی بھی چیز نہیں دیکھ سکتے۔جو عنصر میں نے دریافت کیا ہے ، اُس میں بھی یہ خوبی ہے ۔ اِسی وجہ سے اب تک اُسے سائنسدان دریافت نہیں کر سکے کہ وہ نظر نہیں آتا۔"

"سر ، مجھے تو ڈر لگ رہا ہے" قمر منمنایا۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں" سر سلمان کی آواز آئی اور اِس کے ساتھ ہی قمر غائب ہو گیا اور سر سلمان نظر آنے لگے ۔ اُنہوں نے وہ سائنسی چادر قمر کے اُوپر ڈال دی تھی۔ اب قمر تو اُن سب کو دیکھ رہا تھا لیکن وہ خود اُنہیں نظر نہیں آ رہا تھا ۔

سر سلمان کا کارنامہ ناقابلِ یقین تھا، لیکن انہیں یقین کرنا ہی پڑا۔ آنکھوں دیکھی بات کون جھٹلا سکتا ہے۔

"سر آپ اس چادر کا کیا کریں گے؟" قمر نے پوچھا اس نے چادر واپس سر سلمان کو دے دی تھی۔

"کیا مطلب؟" سر سلمان بولے ۔ چادر ان کے ہاتھ میں تھی لیکن نظر نہیں آ رہی تھی۔

"وہ سر ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ" قمر ہکلانے لگا۔

"ہاں ، ہاں کہو" سر سلمان نے اُسے حوصلہ دیا۔

"سر ، اگر آپ اِجازت دیں تو میں اسے ایک گھنٹے کے لیے لے جاؤں" قمر نے کہا۔

"لیکن کیوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"سر ہاف ٹائم کے فوراً بعد ریاضی کا پیریڈ ہے اور میں ریاضی میں کمزور ہوں۔ ہوم ورک بھی نہیں کیا۔۔۔ آپ یہ چادر مجھے دے دیں تو ۔۔۔" اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی سب ہنس پڑے ۔

ایک دن علامہ اقبال کے ایک دوست فقیر نجمُ الدین اُن سے ملنے آئے ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ علامہ زار و قطار رو رہے ہیں ۔ فقیر نجمُ الدین نے رونے کا سبب پُوچھا تو علامہ نے ایک خط اُن کی جانب بڑھا دیا ، جو انھیں لندن سے کیمرج یُونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے بھیجا تھا اور علامہ سے ان کی ایک فارسی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی تھی ۔

فقیر نجمُ الدین تعجّب سے بولے "مگر اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ آپ کو تو خُوش ہونا چاہیئے کہ دُوسرے مُلکوں کے عالم بھی آپ کے کلام کی قدر کرتے ہیں، اور آپ کا کلام اپنے لوگوں کو پہنچانا چاہتے ہیں"۔

علامہ اقبال نے فرمایا "اسی کا تو رونا ہے کہ جس قوم کے دِل میں خُودی کا اِحساس پیدا کرنے کے لیے میں نے یہ کتاب لکھی، وہ (یعنی مُسلمان) نہ تو پُوری طرح اِس کا مطلب سمجھ سکتی ہے اور نہ اس کی قدر کر سکتی ہے ۔ اس کے برعکس ولایت والے میرا پیغام اپنے لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں، حال آں کہ یہ کتاب میں نے ان کے لیے نہیں لکھی" (مرسلہ قاسم رضا، کوئٹہ)

گاؤں کا برگد

شبیر بیگ ناز

حویلی سے ہٹ کر کے، جوہڑ کے پاس
کھڑا پیڑ برگد کا چپ چپ، اُداس

وسیع اور گھنا اِس کا چھتنار ہے
ہر اِک اِس کی چھاؤں میں سرشار ہے

کڑی دھوپ سے جب بھی گھبراتے ہیں
کساں اِس کی چھاؤں میں ستاتے ہیں

چھڑی ہے یہاں ہیر کی داستاں
ہیں حُقّے کی گڑ گڑ میں باتیں وہاں

کہیں بچّے کھیلے ہیں پل گولیاں
کہیں بارہ ٹہنا، کہیں گوٹیاں

برات آتی ہے جب کوئی گاؤں میں
ٹھہرتی ہے وہ اس کی ہی چھاؤں میں

اِسی کے تلے ہے غمی اور خوشی
اِسی کے تلے کھیل بھی، کام بھی

گھنی شاخیں پھیلی ہیں کچھ اس طرح
ہوں ممتا کے بازو کھلے جس طرح

کئی نسلوں کو جانتا ہے یہ پیڑ
کئی صدیوں سے یوں ہی کھڑا ہے یہ پیڑ

قوم کی امانت

زبیدہ سلطانہ

اسپین یورپ کا ایک مُلک ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال پہلے (711ء میں) اِسے مشہور عرب جرنیل طارق بن زیاد نے فتح کیا اور اِس کا نام اندلس رکھا۔ عربوں نے اِس مُلک پر 600 سال حکومت کی اور اِسے دُنیا کا سب سے خُوش حال اور ترقّی یافتہ مُلک بنا دیا۔ اُس زمانے میں جب کہ سارا یورپ جہالت کی تاریکی میں ڈُوبا ہُوا تھا، اندلس تہذیب و تمدّن اور علوم و فنون کا گہوارہ تھا اور اُس کی یُونی ورسٹیوں میں ایشیا اور افریقہ کے علاوہ یورپی ملکوں کے طالب علم بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

یہ سچّی کہانی اسی اندلس کے ایک خلیفہ امیر عبدالرّحمان بن الحکم کی ہے۔ اِس خلیفہ نے تقریباً آدھی صدی تک اندلس پر حکومت کی۔ اتنی مُدّت اور کوئی خلیفہ حکم راں نہیں رہا۔

امیر عبدالرّحمان بہت دانا، بہادُر اور علم دوست حاکم تھا۔ اِس کے دورِ حکومت میں عوام بہت خوش حال تھے اور امن و امان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

امیر عبدالرّحمان کی کام یاب حُکم رانی کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ اُس نے اپنے دربار میں عالموں اور ہُنر مند لوگوں کو جمع کر رکھا تھا۔ وہ اُن کے علم و ہُنر کی قدر کرتا اور اُن کے صلاح مشورے سے مُلک کا انتظام چلاتا تھا۔

امیر کے دربار میں جہاں بڑے بڑے بہادُر فوجی جرنیل اور نامور عالم فاضل موجود تھے، وہاں اُس وقت کے مشہور شاعر، موسیقار اور مُصوّر بھی اہلِ دربار میں شامل تھے۔ اِنھی میں زریاب نامی ایک ایرانی موسیقار بھی تھا۔ وہ فُرصت کے وقت امیر کا دل بہلاتا اور اپنی جادُو بھری آواز سے اس کے لئے تفریح کا سامان مُہیّا کرتا تھا۔ امیر کے علاوہ اہلِ دربار بھی زریاب کے گانے کے شیدائی تھے۔

ایک دن امیر کے دربار میں محفلِ موسیقی جمی تھی اور زریاب اپنے فن کا جادُو بکھیر رہا تھا۔ امیر اور اُس کے درباری بُت بنے اُس کا گانا سُن رہے تھے۔ جب اُس نے گانا ختم کیا تو لوگ ہوش میں آئے اور اُس کے فن کی داد دینے لگے۔ امیر تو اس قدر خوش ہُوا کہ جوش میں آکر زریاب کو تیس ہزار سونے کی اشرفیاں انعام دینے کا حُکم دے دیا۔ اتنے بڑے انعام کا حُکم سُن کر جہاں زریاب کے ہوش اُڑ گئے، وہاں درباریوں پر بھی سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ حیران تھے کہ امیر کو کیا ہوگیا ہے کہ ایک گیت کے عِوَض وہ گویّے کو اتنی بڑی رقم بخش رہا ہے۔ مگر سب خاموش رہے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اعتراض کرتا۔

بہر حال ، امیر کا حکم بجالانے کے واسطے اُس کا ایک خاص خادِم خزانچی کے پاس پہنچا اور اُسے امیر کا حکم سُنایا خزانچی یہ حکم سُن کر دنگ رہ گیا اور اُسی وقت وزیرِ خزانہ مُوسیٰ بن جدار کے پاس دوڑا گیا۔ موسیٰ ایک دین دار آدمی تھا۔ اُسے نہ صِرف اپنی ذمے داریوں بلکہ اپنی عاقبت کا بھی فکر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیتُ المال یعنی حکومت کا خزانہ عوام کا ہے اور وہ اِس کا مُحافِظ ہے۔ اگر اُس نے اِسے بے جا خرچ کیا تو امیر کے ساتھ وہ بھی قوم کی امانت میں خیانت کرنے کا گُناہ گار ہو گا۔

موسیٰ نے کچھ دیر غور و فکر کرنے کے بعد محکمۂ مال کے دُوسرے افسروں سے مشورہ کیا۔ سب نے ہی امیر کے اِس حکم کی مُخالفت کی اور کہا کہ محض ایک گانے پر کسی شخص کو اتنی بڑی رقم انعام دے دینا فضول خرچی ہے۔ اتنی رقم سے عوام کی بھلائی کے کئی کام ہو سکتے ہیں۔

مشورے کے بعد موسیٰ بن جدار نے امیر کے خادِم سے کہا "ہم سب نے اِس معاملے پر غور کیا تو یہی سمجھ میں آیا کہ امیر نے صرف ایک وقتی جذبے کے تحت یہ حکم دیا ہے۔ بعد میں وہ خود بھی سنجیدگی سے سوچیں گے تو انہیں اِحساس ہو گا کہ یہ رقم زریاب کے حق سے بہت زیادہ ہے۔ تم امیر کی خدمت میں عرض کرنا کہ خزانہ عوام کی مِلکیت ہے۔ یہ امیر کی ذاتی چیز نہیں کہ وہ اسے محض اپنی تفریح کے لیے بے جا خرچ کریں۔ یہ رقم خزانے سے نہیں دی جا سکتی۔ البتہ امیر اپنے ذاتی حساب میں سے دے سکتے ہیں۔"

خادِم یہ جواب لے کر امیر کی خدمت میں حاضر ہُوا اور موسیٰ بن جدار کے الفاظ جُوں کے تُوں دوہرا دیے۔ پُورا دربار سنّاٹے میں آ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ درباری موسیٰ کی جُرأت پر خفگی کا اِظہار کرنے لگے۔ زریاب کی آواز سب سے بلند تھی۔ اُس نے کہا "امیر کے حکم کے خلاف کچھ کہنے کی مُوسیٰ نے کیسے جُرأت کی؟"

زریاب امیر کو بھڑکانا چاہتا تھا اور اہلِ دربار بھی اُس کی آواز میں آواز ملا رہے تھے۔ مگر امیر ایک معقُول اور دانش مند حاکم تھا۔ بات اُس کی سمجھ میں آ گئی۔

امیر نے ہاتھ اُٹھا کر سب کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا اور کہا:

"آپ صاحبان مُوسیٰ بن جدار پر ناراض نہ ہوں۔ اُس نے نہایت معقُول بات کی ہے۔ غلطی واقعی ہماری تھی۔ اُس نے اِس غلطی کا اِحساس دلا کر ہمیں ایک بہت بڑے گُناہ سے بچا لیا۔ ورنہ ہم عوام کے مال میں خیانت کے گناہ گار ہوتے ادر اللہ کی بارگاہ میں ہمیں جواب دینا پڑتا۔ ہم واقعی موسیٰ بِن جدار کے احسان مند ہیں۔"

اِس کے بعد امیر نے وہ رقم جس کا وہ زریاب سے وعدہ کر چکا تھا، اپنے ذاتی حساب سے ادا کر دی۔

کیا آج کے دور میں کوئی حاکم اپنی غلطی اِس طرح مان سکتا

عمران عالی شان

پاکستان کرکٹ ٹیم کے کپتان عمران خان دُنیا کے مانے ہوئے کرکٹر ہیں۔ شروع میں وہ ایک بلّے باز بننا چاہتے تھے لیکن قسمت کی خُوبی سے وہ دُنیا کے فاسٹ باؤلر بن گئے۔

عمران خان نے ابتدائی تعلیم ایچی سن کالج لاہور سے حاصل کی اور 1970ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ انہوں نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز اٹھارہ سال کی عمر میں کیا۔ لیکن یہ آغاز کچھ زیادہ حوصلہ افزا ثابت نہ ہوا اِس لیے وہ انگلستان چلے گئے، جہاں اُنہوں نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کاؤنٹی کرکٹ کھیلنا شروع کی۔ کاؤنٹی کرکٹ نے اِن کے فن کو نئی جِلا بخشی اور روز ان کا بروز کھیل نکھرتا گیا۔

77–1976ء کا سیزن عمران خان کے لیے بہت اہم رہا۔ اِس سیزن میں اُنہوں نے گیارہ ٹیسٹ کھیلے اور ایک کامیاب آل راؤنڈر کے روپ میں دُنیا بھر میں مشہور ہو گئے۔ 1976ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف عمران کو اٹیک باؤلر کے طور پر مُتعارف کرایا گیا۔ اِس ہوم سیریز میں عمران نے آٹھ وِکٹ حاصل کیے۔ اِسی سیزن میں آسٹریلیا کے خِلاف سِڈنی ٹیسٹ میں انہوں نے دونوں اننگز میں بُہت کم رنز دے کر چھ، چھ وکٹیں حاصل کیں۔ پاکستان نے یہ ٹیسٹ دَس وِکٹ سے جیت لیا۔ آسٹریلیا کی سرزمین پر یہ پاکستان کی پہلی فتح تھی۔ اِس ٹیسٹ میں عمران نے ایسے موقعوں پر یہ وکٹیں لیں جب پاکستان کو اِن کی سَخت ضرورت تھی۔ اِسی لیے عمران خان کو سِڈنی کا ہیرو کہا جاتا ہے۔ ویسٹ انڈیز کے خِلاف کھیلتے ہوئے اُنہوں نے اِسی سیزن میں 25 وکٹیں لیں اور کسی سیریز میں 25 وِکٹ لینے والے پہلے پاکستانی باؤلر بنے۔

82–1981ء میں پاکستان کی کرکٹ ٹیم نے آسٹریلیا کا دورہ کیا اور تین ٹیسٹوں کی سیریز میں میلبورن میں کھیلا جانے والا تیسرا ٹیسٹ جیتا۔ اِس فتح میں عمران خان نے اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے پانچ وکٹوں کے ساتھ 70 رنز (ناٹ آؤٹ) بھی بنائے۔

اِسی ٹیسٹ کی پہلی اننگز میں جب اُنہوں نے راڈنی مارش کی وِکٹ حاصل کی تو وہ پاکستان کے سب سے زیادہ وِکٹ لینے والے باؤلر بن گئے۔ پہلے یہ ریکارڈ فضل محمود نے قائم کیا تھا۔ اُنہوں نے 34 ٹیسٹوں میں 139 وکٹیں لی تھیں۔ عمران نے یہ ریکارڈ چھتیسویں ٹیسٹ میں توڑا۔ اِس پوری سیریز میں وہ 16 وکٹ لے کر سرِفہرست رہے اور "مین آف دی سیریز" کا اعزاز حاصل کیا۔

1982ء میں سری لنکا کے خِلاف ہوم سیریز کے تیسرے ٹیسٹ میں عمران نے اپنی زندگی کی بہترین کارکردگی دِکھائی۔ پہلی اننگز میں اُنہوں نے صِرف 58 رنز کے عِوض آٹھ وِکٹیں حاصل کیں اور دوسری اننگز میں 58 رنز دے کر چھ وِکٹ اُکھاڑ پھینکے۔ ایک اننگز میں 14 وِکٹ لینے والے وہ واحد پاکستانی کھلاڑی ہیں۔

عمران خان کی اِس کارکردگی کے پیشِ نظر بی۔ سی۔ سی۔ پی۔ کے عُہدے داروں نے اِنہیں انگلینڈ کے خِلاف آئندہ سیریز کے لیے مُتفقہ طور پر قومی ٹیم کا کپتان نامزد کیا۔

عمران خان بولنگ میں ہمیشہ خطرناک رہے۔ کپتانی سنبھالنے کے بعد اِن کی باؤلنگ میں اور بھی نِکھار پیدا ہو گیا۔ کپتان بننے کے بعد اُنہوں نے برق رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے کپیل دیو اور ہیڈلی کو پیچھے چھوڑ دِیا۔ بحیثیت آل راؤنڈر آئن بوتھم بھی عمران کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ کو نبوت ملتی ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام آٹھ سال حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں رہے۔ آپ اُن کی بکریاں بھی چراتے اور گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کرتے۔

جب آٹھ سال پورے ہوگئے تو حضرت شعیبؑ نے، وعدے کے مطابق، اپنی ایک لڑکی "صفورہ" کے ساتھ آپ کی شادی کر دی۔ ایک سال بعد اللہ میاں نے آپ کو ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا، جس کا نام آپ نے "جیر سون" رکھا۔ جیر سون کا مطلب ہے، اجنبی دیس میں مسافر۔

ایک روز حضرت موسیٰؑ بکریاں چراتے چراتے مدین سے بہت دور نکل گئے۔ صفورہ اور جیر سون بھی آپ کے ساتھ تھے۔ اسی اثنا میں شام ہوگئی۔ سردیوں کے دن تھے۔ بچہ سردی سے کانپنے لگا۔ آپ نے اِدھر اُدھر سے لکڑیاں اکٹھی کیں اور چقماق پتھر سے آگ جلانے کی کوشش کی۔ لیکن ٹھنڈ کی وجہ سے پتھر گیلا ہو گیا تھا۔ بار بار رگڑنے کے باوجود اُس میں سے چنگاری نہ نکلی۔

آپ نے سر اُٹھا کر نظر دوڑائی تو سامنے سینا کا پہاڑ دکھائی دیا۔ اِس پہاڑ کی ایک وادی ایمن میں آگ کا ایک شعلہ بھڑک رہا تھا۔ آپ نے بیوی سے کہا "تم یہیں ٹھہرو۔ میں آگ لے کر آتا ہوں"۔

آپ اُس شعلے کی سمت روانہ ہوئے۔ لیکن جوں جوں اُس کی طرف بڑھتے، وہ پیچھے ہٹتا جاتا۔ یہ دیکھ کر آپ کو خوف محسوس ہوا۔ آپ واپس جانے کے لیے پیچھے پلٹے ہی تھے کہ شعلہ قریب آگیا اور اِس کے ساتھ ہی غیب سے آواز آئی:

"اے موسیٰ! میں تیرا رب ہوں۔ اپنی جوتی اُتار دے۔ تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے۔ اور دیکھ! میں نے تجھے اپنی رسالت کے لیے چن لیا ہے (یعنی تجھے اپنا رسول بنایا ہے)۔ پس تجھ پر جو وحی نازل کی جاتی ہے، اُسے غور سے سُن۔ میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا اور کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ پس میری ہی بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔ اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟"

حضرت موسیٰؑ نے عرض کی "یہ میری لاٹھی ہے۔ میں چلتے وقت اِس کا سہارا لیتا ہوں۔ اِس سے اپنی بکریوں کے لیے درختوں کے پتے توڑتا ہوں۔"

آواز آئی "اے موسیٰؑ! اِسے (زمین پر) ڈال دے!"

حضرت موسیٰؑ نے جوں ہی لاٹھی کو زمین پر ڈالا، وہ ایک خوف ناک اژدہا بن گئی۔ موسیٰؑ ڈر کے پیچھے ہٹے تو آواز آئی "اِسے پکڑ لے۔ خوف نہ کھا۔ ہم اِسے پھر اِس کی اصل حالت میں کیے دیتے ہیں۔" پھر حکم ہُوا کہ اے موسیٰ! اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال اور اُسے بغل سے مَسل۔ آپ نے اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالا اور بغل سے مَسل کر باہر نکالا تو وہ بجلی کی طرح چمک رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ دو معجزے عطا کیے اور اِس کے بعد حکم دیا کہ اب مصر جاؤ، فرعون اور اُس کی قوم کو سیدھے راستے پر لاؤ، اور اپنی قوم، بنی اسرائیل، کو اُن کے ظلم سے نجات دلاؤ۔

حضرت موسیٰؑ نے کہا "اے پروردگار! میری زبان میں لُکنت ہے۔ اِسے دُور کر دے تاکہ لوگ میری بات آسانی سے سمجھ سکیں، اور میرے بھائی ہارون کو بھی نبی بنا دے تاکہ وہ اِس کام میں میری مدد کرے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی درخواست منظور کر لی۔ آپ کی زبان کی ہکلاہٹ دُور ہوگئی اور آپ کے بھائی حضرت ہارونؑ بھی نبی بنا دیئے گئے۔

اِس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام وادی ایمن سے واپس آئے اور بیوی بچے کو لے کر مصر روانہ ہو گئے (باقی اگلے مہینے)

اقبال کی آرزو

مقبول انور داودی

حضرت علامہ اقبالؒ بیسویں صدی کے بہت بڑے مسلمان راہنما تھے ۔ اُنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک نئے اِسلامی مُلک کے قائم ہونے کی خُوش خبری سُنائی ۔ اِس خُوش خبری نے سترہ سال بعد حقیقت کا رنگ اِختیار کیا اور ہمارا عزیز وطن پاکستان دُنیا کے جُغرافیے پر ایک نئی شان سے اُبھرا ۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی بُھولی بِسری کہانیوں کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لیے شاعری کو اپنے مقصد کے اظہار کا ذریعہ بنایا ۔ حضرت علامہ اقبالؒ نے جہاں بڑی عمر کے لوگوں کو اپنے اندر خودداری اور بلند ارادے رکھنے اور اُن پر عمل کرنے کا مشورہ دیا وہاں اپنی قوم کے بچّوں کو بھی نہیں بُھولے ۔ آپ نے مسلمان بچّوں کے لیے بے شُمار نظمیں لکھی ہیں ۔ ان میں ایک نظم "بچّے کی دُعا" بھی ہے جسے ہر روز سکول شُروع ہونے سے پہلے بچّے مِل کر پڑھتے ہیں ۔

سب کو اِس پر اتفاق ہے کہ بچّے کی تعلیم و تربیت ماں باپ، محلّے کا ماحول اور اُستادوں کی نگرانی میں پروان چڑھتی ہے ۔ پیدائش کے وقت بچّے کا ذہن ایک صاف سلیٹ کی طرح ہوتا ہے اِس صاف ذہن پر ماں باپ، دوست احباب اور اساتذہ جو بھی نقش کریں گے، اس پر بچّہ اپنے مستقبل کی تعمیر کرے گا ۔ اچھی تربیت کی جائے گی تو نئی پود آگے چل کر مُلک و قوم کو سرسبز و شادات کرے گی اور باپ دادا کی عزّت کو نہ صرف قائم رکھے گی بلکہ اور بھی بڑھائے گی ۔ دوسری قِسم کے بچّے بڑے ہو کر اپنے بُرے کاموں کی وجہ سے نہ صرف خود مِٹ جائیں گے بلکہ مُلک و قوم کی عزّت کو بھی خاک میں مِلا دیں گے ۔ تاریخ اِس کی گواہ ہے ۔

حضرت علامہ اقبالؒ کی بڑی خواہش رہی کہ مسلمان بچّے قوم کے شاہین بنیں ۔ اس مقصد کو پُورا کرنے کے لیے اُنہوں نے بچّوں کے لیے بے شُمار نظمیں لکھیں ۔ آج ہم علامہ اقبال کی اُس نظم پر بات کریں گے جِس کا عنوان ہے "بچّے کی دُعا" ۔ اور ہر طالب علم کو زبانی یاد ہے ۔ لیکن کِتنے بچّے ہیں جنہوں نے اِس نظم کو پڑھ کر اور سمجھ کر اِس پر عمل کیا ہو گا؟ عمل کے بغیر علم بھی بے کار ہوتا ہے ۔ پڑھا اس لیے جانا چاہیے کہ جو کچھ پڑھا جائے اس میں اپنی زندگی کو ڈھال لیا جائے ۔ اگر علم کے ساتھ عمل نہیں تو یوں سمجھیے کہ اُس نے طوطے کی طرح رٹ لیا ہے ۔ اب دیکھیے آپ پڑھتے ہیں :

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صُورت ہو خدایا میری
دُور دُنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے
ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پُھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو مری پروانے کی صُورت یا رب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبّت یارب
ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درمندوں سے، ضعیفوں سے محبت کرنا
مرے اللہ بُرائی سے بچانا مُجھ کو
نیک جو راہ ہو اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

آپ روز یہ دُعا پڑھتے ہیں لیکن ضرورت یہ ہے کہ جو کچھ پڑھا جائے اُسے سمجھا جائے اور اُس پر عمل بھی کیا جائے تاکہ آپ اپنی اچھی عادتوں سے دُنیا میں نہ صرف اپنا بلکہ اپنی قوم اور مُلک کا بھی وقار بلند کریں ۔ بچہ کہتا ہے کہ :

"زندگی شمع کی صورت ہو خُدایا میری"

یعنی اے خُدا میری زندگی شمع کی صورت ہو ۔ علم ایک روشنی ہے جو پڑھنے والے کے ذہن کو ہی نہیں بلکہ اپنے اِردگرد کو بھی روشن کر دیتی ہے ۔ قرآن حکیم جو اللہ کی آخری کتاب ہے، اِس میں یہ دُعا مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ ربِّ زِدنی علما (اے اللہ میرے علم کو بڑھا اور ترقی دے) ۔ پھر ہمارے پیارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر عِلم کا سیکھنا فرض ہے ۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ عِلم حاصل کرو، خواہ اِس کے لیے تمہیں چین تک کا سفر کرنا پڑے ۔ اُس زمانے میں کوئی شخص چین جانے کی بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا ۔ اب تو سائنس نے دُنیا کو سمیٹ کے رکھ دیا ہے ۔ لہٰذا ہماری قوم کے بچوں کو اقبالؒ کی اِس بات کو گرہ میں باندھ کر اور علم کی شمع سے اپنے دِل و دِماغ کو مُنور کر کے عِلم کی روشنی کو دُور دُور تک پھیلانا چاہیے ۔ پھر آپ پڑھتے ہیں

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درمندوں سے، ضعیفوں سے محبت کرنا

غریب لاچار اور مجبور کی مدد، حمایت اور اُس سے محبت کرنا اِنسانی ہی نہیں اسلامی فرض بھی ہے ۔ لیکن یہ شعر پڑھتے وقت کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ ہم نے کبھی کسی غریب اور لاچار کی مدد کر کے وہ خُوشی حاصل کی ہے جو نیک کام کرنے سے انسان کے دِل میں پیدا ہوتی ہے ۔ آپ ایک نیک کام کر کے دیکھیے اس سے آپ کو خُوشی محسوس ہوگی ۔ اس کے اُلٹ بُرا فعل کرنے سے ندامت اور شرمندگی سی محسوس ہوتی ہے ۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو تجربے کے طور پر کسی ضرورت مند کی حاجت دُور کر کے دیکھ لیجئے اور پھر اللہ سے وعدہ کیجئے کہ ہم علم بھی پڑھیں گے اور غریبوں کی خدمت بھی کریں گے ۔ اگر آج تمام بچے یہ عہد کر لیں تو یقین جانیے کہ آج کا پاکستان جنّت جیسا ہو جائے گا ۔

آخر میں بچہ دُعا مانگتا ہے

میرے اللہ بُرائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

کتنی پیاری دُعا ہے ۔ اللہ نے اِنسان کو عقل دی ہے اور وہ نیکی اور بدی میں آسانی سے تمیز کر سکتا ہے ۔ کوئی ہے جو آگ میں ہاتھ ڈال دے؟ کوئی نہیں ڈالے گا بلکہ وہ تو آگ کی تپش سے بھی دُور رہنا چاہے گا ۔ بُرائی ایک آگ ہے ۔ اس کے برعکس پانی جو انسان کو راحت اور سکون پہنچاتا ہے ، انسان اس کی طرف لپکتا ہے ۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ بُرائی کو چھوڑ کر نیکی کی طرف آئیں ۔

ضرورت ہے کہ ہم بچپن سے ہی اچھے اچھے کام کرنے کی عادت ڈالیں ۔ اس طرح یہ عادت پُختہ ہو جائے گی ۔ بُرائی کرنے میں وقتی طور پر تو کسی قدر لذّت مل جاتی ہے ۔ لیکن آگے چل کر کئی اور بُرائیاں اِس میں شامل ہو جاتی ہیں اور اِنسان اِنسان نہیں، حیوان بن جاتا ہے ۔ ہاں کچھ بڑے لوگ بُرائیوں سے تنگ آکر نیک ہو جاتے ہیں یوں تو بھیڑیا بھی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو نیک ہو جاتا ہے ۔ یہ تو کوئی خُوبی نہ ہوئی ۔

اگر آج سے سب بچے پکّا عہد کر لیں کہ ہم اپنے قومی شاعر حضرت علامہ اقبالؒ کی بات پر عمل کر کے اچھے انسان بنیں گے تو یقین جانیے آپ کی تمام مشکلیں حل ہو جائیں گی اور آپ اپنی دنیا کے جہنّم کو جنت میں بدل دیں گے ۔ کیا آپ سب اس کے لیے تیار ہیں؟

علّامہ اقبال جہاں آپ کو اچھے کام کرنے کی ہدایت کرتے ہیں، وہاں آپ کے لیے دُعا بھی کرتے ہیں ۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
میرا نُورِ بصیرت عام کر دے

یعنی اے اللہ! میری یہی خواہش ہے کہ میری قوم کے بچّوں اور نوجوانوں کو میری آہ و فریاد دے جو صبح کے وقت میں تیری درگاہ میں کرتا ہوں اور یہ شاہین بچے یعنی مسلمان بچّے ہیں ان کو ہمت و طاقت دے کہ وہ آگے بڑھ کر بلندیوں پر پُہنچ سکیں ۔ اے اللہ! میرے دِل کا جو نُور ہے، اس کو عام کر دے تاکہ اِس نُور سے تمام عالمِ اسلام روشن ہو جائے ۔

اِنتخاب

انجم ناز

عاطف گھر آیا تو پتا چلا کہ دو دِن بعد وہ لاہور جا رہے ہیں ۔ عاطف کے ابّو اسلام آباد کے ایک دفتر میں ملازم تھے۔ وہاں سے ان کی تبدیلی لاہور کر دی گئی تھی۔ اور اب دو دِن بعد وہ لاہور جا رہے تھے۔ عاطف لاہور صرف دو بار گیا تھا اور یہ شہر اُسے پسند بھی تھا۔ جدید اور قدیم دونوں ثقافتوں کی عکاسی کرتا خوب صورت شہر ۔ مگر جہاں اسے لاہور جانے کی خوشی تھی، وہاں اسلام آباد چھوڑنے کا دکھ بھی تھا ۔ اسکول کے دوست ۔ محلّے کے دوست ۔ پھر اس کا سب سے اچھا دوست [illegible] ۔

"امّی اتنی جلدی کہاں جا رہے ہیں؟" عاطف بولا ۔ اُس وقت اس کی امّی پیکنگ کرنے میں مصروف تھیں ۔

"اتنی جلدی کہاں [illegible] تھی ۔ اب لاہور تو جانا ہی ہے ۔ ۔ کیوں، تم خوش نہیں ہو؟"

"نہیں، یہ بات نہیں ۔ خوش تو ہوں لیکن ۔ ۔ ۔" عاطف خاموش ہو گیا ۔

امّی نے [illegible] سے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہاں میرے بہت اچھے دوست ہیں ۔ انہیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"اوہ یہ بات ہے" امّی عاطف کی بات سن کر مسکرا دیں۔ پھر [illegible] اگر تم خود اچھے ہو تو اچھے دوست ہر جگہ [illegible]"

"جی" عاطف سر ہلا کر بولا۔

"چلو، تم بھی پیکنگ کر لو ۔ کل تمہارے اسکول چلوں گی۔"

"کیوں ؟"

"تمہارا سرٹیفکیٹ جو لینا ہے ۔ وہاں نئے اسکول میں داخلے کے لئے ضرورت پڑے گی۔"

"اچھا، میں چلتا ہوں" عاطف اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

نیا اسکول اسے اچھا لگا ۔ نئے دوست بھی بہت اچھے لگے ۔ لیکن سب سے اچھے اسے سر امتیاز لگے ۔ انتہائی شفیق اور محنتی ۔

"کیوں بھئی، ہمارے عاطف کو نیا اسکول کیسا لگا؟" اُس رات اُس کے ابّو نے پوچھا۔

"بہت اچھا ہے ۔ لیکن ابھی مجھے اپنے پُرانے دوست یاد آتے ہیں۔"

"ہاں، وہ تو آئیں گے ہی۔ لیکن آہستہ آہستہ جب نئے دوست ملیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ابّو ، انظر بہت اچھا ہے۔"

"انظر؟ کون انظر؟"

"میری کلاس میں پڑھتا ہے ۔ میں اُسے دوست بناؤں گا۔"

"یعنی ہمارے بیٹے کو اپنے مطلب کا دوست مل گیا۔"

"جی ابو۔۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ میرے پاس بہت سی اچھی اچھی کتابیں ہیں۔ میرے ابو مجھے ہر مہینے اچھی کتابیں لاکر دیتے ہیں۔ ابو، اس کے پاس بھی کتابیں ہیں۔"

"اوہو! تو اس لئے دوستی ہوئی ہے" عاطف کے ابو ہنسے۔

"اُس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس ڈھیر ساری کتابیں ہیں۔ میں اس کی کتابیں ضرور پڑھوں گا۔"

"ہاں بیٹا، ضرور پڑھنا۔ کتابوں سے بہتر کوئی دوست نہیں۔"

"ابو، میں بھی اُسے اپنی کتابیں دوں گا۔"

"بھئی، بہت باتیں ہوگئیں۔ چلو اب اپنے کمرے میں جاؤ۔ بہت رات ہوگئی ہے۔ صبح جلدی اٹھنا ہے" عاطف کی امّی نے اندر آکر کہا۔ عاطف اُٹھ کر چلا گیا۔

تھوڑے ہی دنوں میں اُن دونوں کی اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ لیکن ابھی تک وہ ایک دوسرے کے گھر نہیں گئے تھے۔

ایک دن عاطف نے اختر کو گھر آنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا "تم میرے گھر آؤ نا۔ امّی سے ملنا۔ میں نے اُنہیں تمہارے مُتعلق بتایا ہے اور تمہاری کتابوں کا بھی بتایا ہے۔" "ارے ہاں۔ میں بھی تمہاری کتابیں دیکھوں گا" اختر جوش سے بولا "آج ہی چلیں؟"

"نہیں، آج نہیں۔"

"کیوں؟" اختر حیران ہوا۔

"کل تم اپنی امّی سے پوچھ کر آنا۔ اس کے بعد چلنا۔"

"اوہو! اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ جا کر بتا دوں گا کہ تمہارے گھر گیا تھا۔"

"نہیں، بُری بات ہے۔ جب تک تم گھر نہیں جاؤ گے، تمہاری امّی پریشان ہوں گی۔ اِس لئے بہتر یہی ہے کہ پوچھ کر آؤ۔"

"اچھا، چلو، ٹھیک ہے۔ کل چلوں گا" اختر منمنایا۔

دوسرے دن اختر نے اپنی امّی سے اجازت لی اور چُھٹی کے بعد عاطف کے ساتھ چل دیا۔ سارے راستے دونوں باتیں کرتے رہے۔ گھر میں داخل ہوئے تو سامنے ہی عاطف کی امّی بیٹھی تھیں۔ لڑکوں نے سلام کیا تو اُنہوں نے اُن کے سر پر ہاتھ پھیرا عاطف اختر کو لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُس نے اختر کو ایک طرف بٹھایا اور پھر پہلے اپنا بیگ ایک طرف سلیقے سے رکھا، اس کے بعد جُرابیں اور بوٹ اُتارے اور پھر کپڑے اُٹھا کر بولا "تم بیٹھو۔ میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔"

"ارے بھئی، یہ کام بعد میں کر لینا۔ پہلے مجھے کتابیں دکھاؤ" اختر بے چینی سے بولا۔

عاطف نے کہا "پہلے جو کام کرنے چاہئیں، وہی کروں گا۔"

"میں تو ایسا نہیں کرتا" اختر بے پروائی سے بولا۔

عاطف خاموشی سے باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر بعد کپڑے بدل کر اُس کے پاس آگیا۔ اتنی دیر میں امّی کھانا لے آئیں۔

"عاطِف کی دیکھا دیکھی اختر نے بھی ہاتھ دھوئے۔ پھر دونوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد عاطف برتن اٹھا کر باورچی خانے میں رکھ آیا۔

"آؤ، اب میں تمہیں اپنی کتابیں دکھاتا ہوں۔" عاطف اختر کو ایک الماری کے پاس لے گیا اور ایک ایک کتاب نکال کر دکھانے لگا۔ اختر خاموشی سے کتابیں دیکھنے لگا۔

"لگتا ہے، تم خوش نہیں ہو" عاطف بولا۔

"یہ کیسی کتابیں تم نے جمع کر رکھی ہیں؟" اختر نے بیزاری سے کہا۔

"یہ کتابیں تو بہت اچھی ہیں۔ یہ "راہِ عمل" ہمیں زندگی گزارنے کے طریقے سکھاتی ہے۔ "اُسوۂ حسنہ" میں رسولِ کریمؐ کی عادات کے بارے میں لکھا ہے، اور یہ کتاب "سبق آموز حکایتیں" تو بہت ہی اچھی ہے۔ میرے پاس تو بہت ایسی کتابیں ہیں جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے"۔

"مثلاً"؟ اختر نے پُوچھا۔

"ابھی جو کچھ تم نے دیکھا، یعنی صاف سُتھرا کمرا، وقت پر ہر کام، یہ سب میں نے اِن کتابوں سے ہی سیکھا ہے۔ امّی بھی مجھے بہت کچھ بتاتی ہیں۔"

اختر سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچنے لگے؟"

"ہوں۔ کچھ نہیں" اختر چونک گیا۔

کافی دیر تک دونوں کتابیں دیکھتے اور پڑھتے رہے۔ شام کو اختر واپس چلا گیا۔ اب عاطف اختر کے گھر جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ جب بھی اُس سے کہتا، ٹال دیتا۔ عاطف اس کے اس رویّے پر حیران تو ضرور ہوتا لیکن خاموش رہتا۔ تقریباً دو ماہ بعد اختر نے عاطف کو گھر آنے کی دعوت دی تو عاطف بہت حیران ہوا۔

دوسرے دِن اختر عاطف کو اپنے گھر لے گیا۔ اختر کی امی بہت اچھی تھیں اختر نے عاطف کو امی کے پاس بٹھایا اور خُود کپڑے بدلنے چلا گیا۔

"بیٹا، اختر تمہاری بہت تعریف کرتا ہے۔ میں خود تم سے مِلنا چاہتی تھی۔ تم نے تو میرے بیٹے کی زندگی ہی بدل ڈالی۔"

"جی؟ کیا مطلب؟" عاطف کچھ سمجھ نہ پایا۔

"پہلے میں اختر سے بہت تنگ تھی۔ نہ اُسے اپنی کتابوں کا ہوش ہوتا تھا نہ کپڑوں کا۔ بہت ڈانٹ ڈپٹ کے بعد یُونی فارم بدلتا۔ ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کھاتا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ آہستہ آہستہ خود ہی ٹھیک ہوتا گیا۔ سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ اس نے فضول قسم کے جاسوسی ناول پڑھنا بند کر دیے۔"

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اختر آگیا اور عاطف کو لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد اختر اُسے خود ہی اپنی کتابیں دکھانے لگا اور بولا "جانتے ہو میں اِتنے دِن تمہیں کیوں اپنے گھر نہیں لایا؟"

"نہیں" عاطف نے مُختصر سا جواب دیا۔

"اُس دِن جب میں تمہارے گھر گیا، تمہاری کتابیں دیکھیں، تمہیں دیکھا تو میں سمجھا کہ اچھی کتابیں کیا ہوتی ہیں۔ اچھی کتابیں وہ ہوتی ہیں جو ہماری زندگی کو اچھا بنائیں۔ میرے پاس بھی کتابیں تھیں لیکن میرا اِنتخاب غلط تھا۔ کتابیں بہترین ساتھی ضرور ہیں لیکن صرف اُس وقت جب اُن کا اِنتخاب دُرست ہو۔ میرا انتخاب غلط تھا۔ اس لیے میں کچھ نہ سیکھ سکا۔ میں تمہیں گھر لانے سے پہلے اپنا اِنتخاب دُرست کرنا چاہتا تھا۔ وہ سب فضول کتابیں میں نے پھینک دیں اور اچھی کتابیں خریدیں۔ اُن کی دوستی نے مجھے بھی اچھا بنا دیا۔ اب مجھے اپنے اِنتخاب پر فخر ہے۔ اسی لیے آج میں تمہیں اپنے گھر لایا ہوں۔"

عاطف مسکرا دیا اور بولا "اختر، تم بہت اچھے ہو۔"

"اور تم بھی۔ یقیناً میرا اِنتخاب بہت اچھا ہے" اختر بھی مُسکرا دیا۔

پہلے مُرغی پیدا ہوئی یا انڈا؟

اِس بحث کو چھوڑیے کہ پہلے انڈا پیدا ہُوا یا مُرغی۔ آپ کو آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گِننے سے؟ انڈے کھائیے اور خُوب کھائیے، کیوں کہ انڈا سوائے دِل کے مریضوں کے، ہر عُمر کے لوگوں کے لیے بہترین غِذا ہے۔ اِس میں پروٹین، وٹامن، لوہا اور کیلشیم اِفراط سے ہوتے ہیں، اور یہ سب چیزیں صحت کے لیے بہت مُفید ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ کہ انڈے میں کاربوہائڈریٹ (چکنائی) نہیں ہوتی، جس سے جِسم موٹا ہوتا ہے۔ جو لوگ مُٹاپے سے ڈرتے ہیں، وہ انڈے ڈٹ کر کھا سکتے ہیں۔

آدھا اُبلا ہُوا انڈا (ہاف بوائلڈ) جلد ہضم ہو جاتا ہے۔ سخت اُبلا ہُوا (ہارڈ بوائلڈ) ثقیل ہوتا ہے اور دیر سے ہضم ہوتا ہے۔ ہاف بوائلڈ تین چار منٹ میں اور ہارڈ بوائلڈ آٹھ دس منٹ میں تیار ہو جاتا ہے۔

اُبلے ہُوئے انڈے کو بائیں ہاتھ میں سیدھا پکڑ کر اُس کے نُکیلے سِرے پر آہستہ آہستہ چمچہ ماریے۔ چھلکا ٹُوٹ جائے تو اس کا اِتنا حصّہ اُتار لیجیے کہ چمچہ انڈے کے اندر داخل ہو سکے۔ اب نمک مرچ چھڑک کر کھائیے۔ اِس بات کا خیال رکھیے کہ سفیدی یا زردی کپڑوں پر نہ گِرے۔ اگر غلطی سے گِر جائے تو فوراً اُلٹی چُھری یا چاقو سے صاف کر دیجیے اور پھر ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیے۔ اِس سے کپڑے پر داغ نہیں پڑے گا۔ گرم پانی سے داغ اور گہرا ہو جاتا ہے۔ گرم پانی اِستعمال نہ کیجیے۔

اُبلے ہُوئے انڈے کچّے انڈوں میں مِل جائیں تو کس طرح پتا چلائیں گے کہ اُبلا ہُوا کون سا ہے اور کچّا کون سا؟ انڈے کو میز پر چُٹکی سے گھمائیے۔ لٹّو کی طرح گھومنے لگے تو اُبلا ہُوا ہے ورنہ کچّا۔

دُوسری بات یہ کہ اُبلے ہُوئے انڈے کے چھلکے پر چمک نہیں ہوتی۔ تھوڑی پیلاہٹ آ جاتی ہے۔

فرسٹ ایڈ

فریکچر ریڑھ کی ہڈّی

ڈاکٹر شاہد صدیق

ریڑھ کی ہڈی کے فریکچر پر بحث کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس ہڈی کی اہمیت پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔

یہ ہڈی ایک ہڈی نہیں ، بلکہ چھوٹی چھوٹی بہت سی ہڈیوں سے مل کر بنتی ہے ۔ ان چھوٹی ہڈیوں کو مُہرے کہتے ہیں ۔ یہ مل کر ایک ہڈی بناتے ہیں تو درمیان میں ایک چھوٹا سا راستہ چھوڑ دیتے ہیں جس میں حرام مغز ہوتا ہے ۔

دو مہروں کے درمیان کُرکُری ہڈی ہوتی ہے جو جھٹکوں کو جذب کر لیتی ہے اور اِس طرح اِن کو چوٹ سے بچاتی ہے ۔ پوری ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط پٹھے سہارا دیتے ہیں ۔

حرام مغز میں سے اعصاب نکلتے ہیں جو جسم کے مختلف کاموں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اگر ریڑھ کی ہڈی پر کہیں چوٹ لگ جائے تو اُس جگہ سے نیچے جسم کی طاقت ختم ہو جاتی ہے ۔ اگر چوٹ ہلکی ہو تو یہ کمزوری عارضی ہوتی ہے ورنہ مستقل ۔ ریڑھ کی ہڈی کو جو چوٹ لگتی ہے اُس میں اس کا فریکچر ، دو مُہروں کے درمیان ہڈی کا کِھسک جانا یا ہڈّی کا مُڑ جانا شامل ہیں۔

ریڑھ کی ہڈی کا فریکچر براہِ راست چوٹ یا بلاواسطہ چوٹ کے نتیجے میں ہو سکتا ہے ۔ کسی گاڑی سے ٹکرانے یا گاڑی کے آدمی کی پُشت پر سے گزر جانے سے یہ فریکچر ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح زور سے گرنے سے بھی پاؤں یا کولہوں پر یہ فریکچر ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی گاڑی میں بیٹھا ہو اور پیچھے سے کوئی دوسری گاڑی زور سے ٹکرائے تو اُس آدمی کی گردن کو پیچھے کی طرف زور سے جھٹکا لگنے سے بھی یہ ہڈی فریکچر ہو سکتی ہے ۔ گردن اور کمر کے حصّے میں اِس ہڈی کے ٹوٹنے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں ۔

علامات :-

(۱) مریض کی پُشت پر بہت زیادہ درد ہو گا اور اسے ایسا محسوس ہو گا جیسے اُسے دو حصّوں میں کاٹ دیا گیا ہو۔

(۲) مریض اکثر اپنی ٹانگوں کو حرکت نہیں دے سکتا ۔ اُسے اپنے ہاتھ اور اُنگلیاں ہلانے کے لئے کہنا چاہئیے ۔

(۳) زخم کے نیچے محسوس کرنے کی حِس بھی ختم ہو جائے گی ۔

(۴) ریڑھ کی ہڈی ٹیڑھی محسوس ہو گی۔

ایسے مریض کے علاج میں سب سے پہلی بات یہ ضروری ہے کہ مریض کو کم سے کم ہلایا جُلایا جائے اور اُسے جلد سے جلد ہسپتال پہنچا دیا جائے ۔

علاج :- (کمر میں فریکچر)

(۱) مریض سے کہیں کہ وہ بالکل نہ ہلے ۔

(۲) اگر یہ امید ہو کہ مریض کو جلد ہسپتال لے جایا جا سکتا ہے تو ایک

آدمی ہاتھوں سے مریض کے سر کو ہلنے سے روکے اور دوسرا آدمی اُس کے پاؤں کو سہارا دے ۔ کپڑے کو موڑ کر اور اُس کے پیڈ بنا کر مریض کے جسم کے دونوں طرف رکھ دیں تاکہ جسم کو ہلنے سے روکا جاسکے۔

(۳) اگر مریض کو ہسپتال لے جانے میں دیر ہو تو اُس کی ٹانگوں کے درمیان کوئی کپڑا رکھ کر اُس کے پاؤں پر پٹّی کو آٹھ کے ہندسے کی طرح باندھ دیں ۔ اسی طرح اُس کے گھٹنوں کو بھی باندھ دیں ۔ اِس دوران مریض کے سر کو سہارا دیئے رکھیں ۔

(۴) مریض کو ہسپتال لے جاتے وقت سخت سٹریچر پر لٹائیں۔ اُس کے جسم کو ایک ساتھ حرکت دیں ۔ ایسا نہ ہو کہ ٹانگیں پہلے اُٹھا لیں اور دھڑ بعد میں ۔ اس سے فریکچر بڑھ جانے کا خطرہ ہوتا ہے ۔

گردن میں فریکچر:۔

(۱) مریض کو ہلنے سے منع کریں اور اُس کے سر اور کندھوں کو سہارا دیں ، جب تک کہ مدد نہ آجائے ۔

(۲) ہسپتال لے جانے میں دیر ہو تو ایک کالر بنائیں ۔ کالر بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی اخبار کو فولڈ کریں اور اُس پر ایک تکونی پٹّی جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے ، باندھیں اور پھر اُس پٹّی کو گردن پر باندھ دیں ۔

(۳) مریض کو کمبل سے ڈھانپ دیں ۔

(۴) مریض کو ہسپتال لے جاتے وقت اُن چیزوں کی احتیاط کریں جو کہ اوپر بیان کی گئی ہیں ۔

نیون کیا ہے؟

رات کے وقت شہر کے چوراہوں اور دُکانوں پر رنگ برنگ روشنیوں کی شکل میں قسم قسم کے اشتہارات نظر آتے ہیں۔ ان رنگ برنگ روشنیوں کو Neon Lights یعنی نیون گیس کی روشنیاں کہتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام روشنیاں نیون گیس کی روشنیاں نہیں ہوتیں۔ ان میں دُوسری گیسیں مثلاً ہیلیم (Helium)، آرگن (Argon)، کرپٹن (Krypton) اور زینن (Xenon) بھی استعمال ہوتی ہیں۔

ان گیسوں میں جب بجلی کا کرنٹ دوڑایا جاتا ہے تو ہر گیس سے الگ الگ رنگ کی روشنی خارج ہوتی ہے۔ نیون گیس کی روشنی سُرخ نارنجی، آرگان کی سُرخی مائل نیلی اور ہیلیم کی سفید، پیلی یا بعض وقت بنفشی ہوتی ہے (اس کا انحصار درجۂ حرارت اور بجلی کے وولٹیج پر ہے)۔ کرپٹن گیس سے پیلی، سبز یا زردی مائل بنفشی اور زینن سے نیلی یا نیلی ہری روشنی نکلتی ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ جب نیون گیس میں سے بجلی کا کرنٹ گزرتا ہے تو اُس کی توانائی نیون کے کچھ ایٹموں سے الیکٹرون کو الگ کر دیتی ہے۔ جب یہ الیکٹرون نیون کے ایٹموں سے دوبارہ ملتے ہیں تو اس سے روشنی کی شکل میں توانائی یا انرجی خارج ہوتی ہے۔

اُوپر جو گیسیں بتائی گئی ہیں، انہیں نفیس (نوبل) گیسیں کہتے ہیں۔ یہ کم یاب گیسیں بھی کہلاتی ہیں کیوں کہ انھیں بہت مشکل سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ تمام گیسیں کیمیائی طور پر بے عمل ہوتی ہیں۔ یعنی یہ جلتی نہیں ہیں اور عام حالات میں کیمیائی مُرکبات بھی نہیں بناتیں۔

تمام گیسیں ہوا سے حاصل کی جاتی ہیں (سوائے ہیلیم کے جو قُدرتی گیس سے حاصل ہوتی ہے) اور ہوا میں موجود دُوسری گیسوں (آکسیجن، نائٹروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ) کے ساتھ ملی ہوتی ہیں۔

ان نفیس گیسوں کو حاصل کرنے کے لئے ہوا کو بُہت کم درجۂ حرارت پر ٹھنڈا کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ سیّال (Liquid) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس سیّال یا رقیق ہوا کو ایک بڑے برتن میں گرم کیا جاتا ہے۔ جُوں ہی کوئی گیس اپنے نقطۂ جوش (بوائلنگ پوائنٹ) پر پہنچتی ہے، وہ سیّال سے الگ ہو جاتی ہے اور اُسے ایک خاص برتن میں بھر لیا جاتا ہے۔

ہیرا چمکتا کیوں ہے؟

فرض کیجیے ہیرے اتنے کم یاب نہ ہوتے جتنے آج ہیں۔ فرض کیجیے یہ اتنے سستے ہوتے کہ ہر شخص انھیں خرید سکتا۔ تو کیا اس پر بھی ان کی اتنی ہی قدر ہوتی جتنی آج ہے؟

جی ہاں، یہ اتنے ہی قابل قدر ہوتے جتنے آج ہیں۔ کیوں کہ دو چیزیں لوگوں کو ہیرے حاصل کرنے پر اکساتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہیرا بہت خُوب صُورت ہوتا ہے، اور دُوسری یہ کہ اب تک جتنی بھی معدنیات دریافت ہُوئی ہیں، ہیرا ان سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے اور اپنی اسی سختی کی وجہ سے بعض صنعتوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔

ہیرے قُدرتی عمل سے بنتے ہیں۔ لاکھوں سال قبل ہماری زمین آگ کا ایک دہکتا ہُوا گولا تھی۔ پھر یہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہونا

شُروع ہوئی۔ اُس وقت زمین کے اندر اِدھر اُدھر پگھلی ہُوئی چٹانوں کے ڈھیر جمع تھے۔ ان ڈھیروں پر شدید حرارت کے ساتھ دباؤ بھی پڑتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاربن کے سالمے (مالیکیول)

آپس میں گُتھ کر بلور یعنی کرسٹل بن گئے ۔ ہیرا دراصل خالص کاربن کا کرسٹل ہی ہوتا ہے ۔

جب ہیرے کان سے نکالے جاتے ہیں تو اُن کے ساتھ دُوسری چیزیں بھی ملی ہوتی ہیں ۔ انسان انھیں صاف کر کے اور کاٹ چھانٹ کر چمک دار بناتا ہے ۔ اکثر ہیروں کو کاٹ کر اُن کے دو حصّے کیے جاتے ہیں ۔ پھر ان حصّوں کو تراش کر گول ہیرے کی شکل دی جاتی ہے ۔ اس کے بعد ان میں ایک تیز آلے سے چھوٹے چھوٹے پہل (Facets) تراشے جاتے ہیں ۔ ایک اوسط درجے کے ہیرے میں 58 یا اس سے بھی زیادہ پہل ہوتے ہیں ۔ انھی میں سے شعاعیں نکلتی ہیں اور ہیرا جگ مگ کرتا ہے ۔

ہیرے میں اِنعطافی (Refractive) یعنی موڑنے کی طاقت بہت شدید ہوتی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہیرے کے اندر روشنی داخل ہوتی ہے تو وہ اسے موڑ دیتا ہے ۔ اس طرح روشنی ہیرے کے آر پار نکلنے کے بجائے مُڑکر واپس مُنعکس ہوتی ہے ۔ چناں چہ جب ہم ہیرے کی طرف دیکھتے ہیں تو روشنی کی ایک بڑی مقدار مُنعکس ہو کر واپس ہماری آنکھوں کی طرف آتی ہے اور ہیرا زیادہ چمک دار دکھائی دیتا ہے ۔ ہیرا روشنی کے مختلف رنگوں کو الگ الگ بھی کر دیتا ہے جس سے اُس کی چمک میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔

آج سے تقریباً 500 سال پہلے تک ہیرے زیور کے طور پر استعمال نہیں ہوتے تھے ۔ 1430ء میں فرانس کی ایک دولت مند عورت نے اپنی انگوٹھی میں ایک ہیرا جڑوایا تو لوگوں نے اسے بہت پسند کیا اور پھر آہستہ آہستہ تمام دُنیا میں ہیرے زیورات میں جڑوائے جانے لگے ۔ ہیرے جڑے زیور عام زیوروں کے مُقابلے میں بہت قیمتی ہوتے ہیں۔

ایندھن کیا ہے؟

ایندھن اُن چیزوں کو کہتے ہیں جنھیں جلا کر ہم حرارت، روشنی اور توانائی (اِنرجی) حاصل کرتے ہیں ۔ جلنے کا یہ عمل کیمیائی رَدِّ عمل کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ اس عمل میں ہوا میں موجود آکسیجن اہم کردار ادا کرتی ہے ۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آکسیجن کے بغیر کوئی چیز نہیں جل سکتی ۔

ایندھن کی کئی قسمیں ہیں ۔ لیکن عام قسمیں لکڑی ، کوئلا، قُدرتی گیس (جو ہمارے چُولھوں میں جلتی ہے) اور پٹرول ہیں ۔ انھیں ہم ٹھوس ایندھن، سیّال ایندھن اور گیسی ایندھن بھی کہ سکتے ہیں ۔

انسان نے سب سے پہلے لکڑی کو ایندھن کے طور پر استعمال کیا اور صدیوں تک لکڑی ہی انسان کو حرارت اور روشنی مُہیّا کرتی رہی، کیوں کہ یہ آسانی سے مل جاتی تھی اور سستی بھی پڑتی تھی ۔ لیکن آج سے چار سو سال پہلے جب بعض علاقوں، خُصوصاً یورپ، میں لکڑی کی کمی ہو گئی تو اس کی جگہ کوئلا استعمال کیا جانے لگا ۔

کوئلے میں کاربن کافی مقدار میں ہوتی ہے اور یہ ادھاتی عُنصر یعنی کاربن اکثر ایندھنوں کا اہم حصّہ ہے ۔ جن ایندھنوں میں کاربن کی فی صد مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے، وہ بہت زیادہ حرارت خارج کرتے ہیں ۔ پتھّر کے کوئلے میں، جس میں پتھّر کا جُزو زیادہ ہوتا ہے، دُوسرے کوئلوں کی نسبت کاربن کی مقدار زیادہ ہوتی ہے ۔ اس لئے اس میں سے دُھواں کم نکلتا ہے اور راکھ بھی کم ہوتی ہے ۔

سب سے اہم سیّال ایندھن پٹرولیم سے حاصل ہوتے ہیں مثلاً مٹّی کا تیل اور پٹرول وغیرہ ۔

(سعید لخت)

آئیے مسکرائیں

بیوی (شوہر سے): آپ آج صبح جو چھ انڈے لائے تھے، اُن میں سے چار بطخ کے تھے۔
شوہر: آپ کو کس طرح معلوم ہوا؟
بیوی: اب میں اتنی بھی کم عقل نہیں ہُوں۔ میں نے انھیں اُبالنے کے لیے پانی میں ڈالا تو بطخ کے انڈے تیرنے لگے اور مُرغی کے ڈوب گئے (فرحانہ نورین زیب، حسن ابدال)۔

ایک کنجوس مرنے لگا تو لوگوں نے کہا "اب تو خُدا کے نام پر کُچھ دے دو"۔
کنجوس بولا "جان تو دے رہا ہُوں۔ اور کیا دُوں"؟ (مرزا کامران شفیق، فیصل آباد)

ایک فوجی افسر نے اپنی ترقی کی خُوشی میں فوجیوں کو دعوت دی اور اُن سے کہا "کھانے پر اِس طرح ٹُوٹ پڑنا جس طرح دُشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں"۔
ایک فوجی نے خُوب ڈٹ کر کھانا کھایا اور جب پیٹ میں جگہ نہ رہی تو کھانے کی چیزیں اُٹھا اُٹھا کر جیبوں میں رکھنے لگا۔
افسر نے غصے سے کہا "یہ کیا کر رہے ہو"؟
فوجی نے جواب دیا "سر، جتنے دُشمنوں کو مار سکا، مار دیا۔ باقی کو قیدی بنا رہا ہوں"۔ (عبدالرحمن عبدالحلیم، نیو ٹاؤن کراچی)۔

تین آدمی بس میں سوار ہُوئے۔ رش کی وجہ سے دو بس کے اندر بیٹھ گئے اور تیسرا چھت پر چڑھ گیا۔ کنڈکٹر نے بس کے اندر بیٹھے ہُوئے آدمیوں سے کرایہ مانگا اور پُوچھا "کتنی سواریاں ہیں"؟ اُن آدمیوں نے جواب دیا "$\frac{1}{2}$ 2"
کنڈکٹر نے حیران ہو کر پُوچھا "کیا مطلب"؟
آدمیوں نے جواب دیا "ایک اُوپر، دو نیچے" (عبدالعلیم اعوان، کھولہ کیہال ایبٹ آباد)۔

ارشد (محمود سے): بھئی، یہ سرکس کے بازی گر رسّی پر کیوں چلتے ہیں؟
محمود: یہ لوگ پُل صراط پر چلنے کی پریکٹس کرتے ہیں (عظمیٰ حاجی یونس، کراچی)۔

ایک دفعہ اکبر الہ آبادی کو اُن کے کسی دوست نے ایک ٹوپی دی، جس پر قُل ہُو اللہ احد کڑھا ہُوا تھا۔
اکبر الہ آبادی نے ٹوپی دیکھ کر کہا "بھئی، ٹوپی تو بہت عمدہ ہے۔ کسی دعوت میں کھانا ملنے میں دیر ہو جائے تو یہ ٹوپی پہن لیں گے۔ میزبان سمجھ جائے گا کہ ہماری آنتیں قُل ہُو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ (نجیب احمد، ماڈل ٹاؤن لاہور)۔

سعید (مسعود سے): تم اُس شخص کے بارے میں جانتے ہو جس نے دیوار کے آرپار دیکھنے والی چیز ایجاد کی تھی؟
مسعود: نہیں۔ لیکن وہ کیا چیز ہے؟
سعید: کھڑکی (قاسم، ثوبیہ، مہرین، رائل پارک لاہور)

ساجد (سلیم سے): پتا ہے، آج ایک لڑکا سڑک پر کیچڑ میں گر گیا۔ سارے لوگ ہنسنے لگے مگر میں نہیں ہنسا۔
سلیم: کیوں؟
ساجد: وہ لڑکا میں ہی تھا۔ (نازیہ شمیم، فائزہ شمیم حیدر آباد)۔

ماں نے ننھے ظفر سے پوچھا "ایک باڑے میں بارہ بھیڑیں ہیں۔ ایک بھیڑ باڑے میں سے باہر نکل گئی۔ بتاؤ، باڑے میں کتنی بھیڑیں باقی بچیں"؟
"ایک بھی نہیں" ظفر نے فوراً جواب دیا۔
ماں نے کہا "اس سوال کا صحیح جواب ہے، گیارہ بھیڑیں۔ معلوم ہوتا ہے تم حساب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے"۔
ظفر بولا "اور لگتا ہے آپ بھیڑوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ جب ایک بھیڑ باڑے سے نکلے گی تو اُس کے پیچھے پیچھے تمام بھیڑیں نکل جائیں گی۔ اسی کو بھیڑ چال کہتے ہیں"۔ (عدیل ارشد، سمن آباد لاہور)۔

بلال (جلال سے): دُنیا کا سب سے طاقت ور انسان کون ہے؟
جلال: ٹریفک کا سپاہی، صرف ایک ہاتھ سے سینکڑوں گاڑیاں روک لیتا ہے۔ (طیب نوید، اسلام آباد)۔

ایک جگہ دو کاریں آپس میں ٹکرا گئیں۔ دونوں ڈرائیور لڑنے لگے۔ ایک بولا "قصور تمہارا ہے۔ تم نے مڑتے ہوئے ہاتھ نہیں دیا"۔
دوسرا ڈرائیور غصے سے کہنے لگا "اتنی بڑی کار تو تمہیں نظر نہیں آئی۔ ہاتھ کیا نظر آتا"۔
(جاوید عبدالکریم، کراچی)

میرا کارنامہ

سلمان علی ، کراچی

پچھلے مہینے میرے والد صاحب اور چچا جان نے مِل کر شکار کا پروگرام بنایا ۔ میرا خیال تھا کہ ابُو مجھے بھی اپنے ہمراہ شکار پر لے جائیں گے لیکن میری امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب انہوں نے انکار کر دیا لیکن جب میں نے ان کی منّت سماجت کی اور بڑے ہاتھ پاؤں جوڑے تو وہ مان گئے ۔

اگلے روز صُبح سویرے ہم چار آدمی یعنی میں ، میرے چچا ، والد اور میرا چچا زاد بھائی وحید جیپ میں بیٹھ کر جنگل کی طرف روانہ ہوئے ۔ وحید عمر میں مُجھ سے 6 سال بڑا ہے ۔ تقریباً 5 گھنٹے کے سفر کے بعد ہم جنگل میں پہنچ گئے ۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہم نے تھوڑی دیر خیمے میں آرام کیا اور پھر شکار کو نکل کھڑے ہوئے ۔

ابا جان اور چچا جان تو شکار کی تلاش میں دور نکل گئے ، وحید اور میں خیمے کے نزدیک ہی چھوٹے موٹے پرندوں کا شکار کرنے لگے ۔ میرے پاس غُلیل تھی اور وحید اپنی شارٹ گن لایا تھا ۔

جب شام ہو گئی اور ابا جان اور چچا جان لوٹ کر نہ آئے تو ہمیں پریشانی ہوئی ۔ جب سورج غروب ہونے لگا اور تاریکی چھانے لگی تو مجھ سے رہا نہ گیا ۔ میں نے وحید سے کہا ”اب ہمیں ابُو اور چچا جان کو تلاش کرنا چاہیے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی مصیبت میں پھنس گئے ہوں“۔

وحید نے میری بات مان لی اور ہم اسی سمت چل پڑے جس طرف ابا جان اور چچا جان گئے تھے ۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی نظر آئی ۔ مجھے نہ جانے کیوں ایک عجیب سا احساس ہوا ۔ وحید نے بھی شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا ”کیا خیال ہے اس جھونپڑی کے بارے میں“؟

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور چُپ چاپ جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگا ، وحید نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دینا چاہی ۔ لیکن میں نے اسے روک دیا اور جھونپڑی کی کھڑی میں سے اندر جھانک کر دیکھا ۔ جیسے ہی میری نظر جھونپڑی کے اندر پڑی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ جھونپڑی کے اندر میرے ابّو اور چچا بندھے پڑے تھے ۔ دونوں بیہوش تھے اور ایک آدمی جس کے ہاتھ میں رائفل تھی ، کُرسی پر بیٹھا اُونگھ رہا تھا ۔

پہلے تو دونوں یہ صُورت حال دیکھ کر بوکھلا گئے پھر اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ۔ میں نے وہ ترکیب وحید کو بتائی تو پہلے تو وہ گھبرایا لیکن پھر اُس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا ۔

ہم نے ایک موٹا سا ڈنڈا تلاش کیا اور پھر میں نے دروازے پر دستک دی ۔ چند لمحوں بعد اندر سے آواز آئی ”کون ہے؟“ میں نے اپنی آواز میں درد پیدا کرتے ہوئے کہا ”خُدا کے لیے ایک دُکھی اور مجبور انسان کی مدد کرو کچھ کھانے کو دے دو۔“ یہ کہہ کر میں فوراً دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا ۔ یہاں سے وحید کا کام شروع ہوتا تھا جو دروازے کے دوسری طرف چُھپا ہوا تھا ۔ جیسے ہی دروازہ کھلا اور رائفل والا شخص باہر آیا وحید نے پوری قوت سے ڈنڈا اس کے سر پر رسید کیا ۔ وہ کراہ کر گر پڑا۔ وحید اس پر پے در پے وار کرتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گیا ۔

پھر میں اور وحید جلدی سے اندر پہنچے ، ابُو اور چچا کو ہوش میں لائے ۔ انہیں اپنا کارنامہ سنایا ۔ وہ دونوں بہت خوش ہوئے ۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ شکار کھیل رہے تھے کہ اچانک کسی نے پیچھے سے ان کے سر پر وار کیا اور وہ بے ہوش ہو گئے ۔ جب انہیں ہوش آیا تو اپنے آپ کو اس جھونپڑی میں پایا ۔

ہم نے اس شخص کو اچھی طرح رسّیوں سے جکڑ دیا ۔ پھر اسے ہوش میں لائے ۔ اس نے تھوڑی دیر کی پوچھ گچھ کے بعد بتایا کہ اس کے گروہ کا کام لوگوں کو اغوا کر کے ان کے رشتے داروں سے پیسے بٹورنا ہے ۔

ہم اس شخص کو لے کر شہر آئے اور پھر پولیس کی مدد سے اس کے پورے گروہ کو گرفتار کروا دیا ۔

(پہلا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

2

شہلا ظفر ، اسلام آباد

وہ 10 اپریل 1988ء کی ایک خوف ناک صُبح تھی ۔ تقریباً ساڑھے دس بجے کا وقت تھا کہ راولپنڈی اوجڑی کیمپ میں زبردست دھماکا ہوا اور اس کے بعد راولپنڈی اور اسلام آباد کے

جھیوں پر مزائلوں اور بموں کی بارش ہونے لگی ۔ ہم لوگ اسلام آباد میں رہتے ہیں ۔ تمام لوگ بدحواسی کے عالم میں گھروں سے باہر نکل گئے ۔ جس کا جدھر مُنہ اٹھا ، اسی طرف بھاگا جا رہا تھا ۔ کئی کئی فٹ لمبے مزائل چاروں طرف گر رہے تھے ، اور جہاں بھی وہ گرتے تھے ، آگ لگ جاتی تھی ۔ کتنے ہی خوب صورت گھر دیکھتے ہی دیکھتے ملبے کا ڈھیر بن گئے ۔

ہمارے گھر کے نزدیک بھی ایک مزائل آکر گرا تو میں بھی گھر والوں کے ساتھ باہر آگئی ۔ اتنے میں ہمارے نزدیک ہی ایک گھر پر بم گرا اور اُس کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ میں نے دیکھا کہ اس گھر میں سے ایک جوان عورت ایک بوڑھی خاتون کو تھامے باہر نکلی ۔ دونوں بدحواس تھیں ۔ جوان عورت بھی بیمار نظر آتی تھی اور اس سے چلا نہیں جا رہا تھا ۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ میرے بچے کو بچاؤ! خدا کے لیے میری مدد کرو!

اس عورت کی فریاد سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں بغیر سوچے سمجھے جلتے ہوئے گھر میں گھس گئی ۔ اندر ہر طرف آگ ہی آگ تھی ۔ دھواں اتنا تھا کہ کچھ نظر نہ آتا تھا ۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا ۔ میں نے اس کالے سیاہ دھوئیں اور آگ کے سرخ شعلوں میں بچے کو ڈھونڈا اور آخر کار اس معصوم کو اٹھا کر باحفاظت اس کی ماں تک پہنچا دیا ۔ لیکن میرا دایاں بازو بری طرح جل گیا تھا ، جس کا نشان آج بھی میرے بازو پر موجود ہے ۔ مزید یہ کہ میرے گھنے لمبے بال بھی اس ظالم آگ میں جُھلس گئے تھے لیکن مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں نے ایک ماں کے جگر کے ٹکڑے کو بچا لیا ۔ آج بھی وہ دن یاد کرتی ہوں تو میرا سر فخر سے اُونچا ہو جاتا ہے ۔

(دوسرا انعام : 45 روپے کی کتابیں) ۔

3

فیصل نوید ، گوجرانوالہ

گذشتہ سال موسمِ گرما کی تعطیلات کے دوران ہمارے پرنسپل صاحب نے ہماری جماعت کے بچّوں کو ایوبیہ کی سیر کے لیے بھیجا ۔ سفر کے لیے ایک عدد بس کا بندوبست کیا گیا تھا ۔ بچّوں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی اور ان کے ساتھ تین اُستانیاں تھیں ۔ ہم صُبح سویرے روانہ ہوئے اور مری سے ہوتے ہوئے خیرا گلی پہنچے تو زبردست موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور آگے سڑک بند تھی ۔

یہاں کاروں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی ۔ چند ایک گدھا گاڑیاں بھی تھیں ۔ ہم بس میں بیٹھے بارش کے رکنے کا انتظار کرنے لگے ۔ بارش رُکی تو میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بس سے نیچے اُترا اور یہ دیکھنے کے لیے آگے بڑھا کہ ٹریفک کیوں رک گئی تھی ۔ تھوڑی دُور آگے گیا تو دیکھا کہ ایک درخت سڑک پر گرا پڑا ہے ۔ گدھا گاڑیوں والے اس درخت کو اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے ۔ مگر بے سُود ۔ کاروں والے اپنی کاروں میں بیٹھے شاید کسی کرین یا آسمانی فرشتے کا انتظار کر رہے تھے جو آکر درخت کو سڑک سے ہٹائے ۔

میں سوچنے لگا کہ درخت کو وہاں سے کیسے ہٹایا جائے ۔ ایک دم میرے ذہن میں وہ کہانی آگئی جس میں بہت سے پرندے ایک جال میں پھنس جاتے ہیں ۔ لیکن وہ اس میں سے نکلنے کی جدّوجہد نہیں کرتے ۔ پھر ایک پرندہ کہتا ہے کہ اگر ہم سب مل کر پرواز کریں تو جال کو اُڑا کر لے جاسکتے ہیں اور شکاری سے ہماری جان چھوٹ سکتی ہے ۔ چنانچہ سب پرندوں نے مل کر زور لگایا تو وہ جال لے کر اُڑ گئے اور شکاری دیکھتا رہ گیا ۔

یہ کہانی یاد آتے ہی میں اپنی میڈم کے پاس بھاگا بھاگا گیا اور ان سے کہا کہ اگر ہم سب لڑکے مِل کر درخت کو ہٹانے کی کوشش کریں تو سڑک صاف ہو سکتی ہے ۔ میڈم نے شفقت بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور درخت ہٹانے کی اجازت دے دی ۔ بس پھر کیا تھا تمام بچّوں نے درخت پر دھاوا بول دیا ہمیں دیکھ کر کاروں والے حضرات کو بھی شرم آئی اور وہ بھی ہماری مدد کرنے لگے ۔ آخر سب نے مل کر زور لگایا اور درخت کو کھینچ کر ایک طرف کر دیا ۔ میڈم نے تو اسے میرا کارنامہ قرار دیا ، نہ جانے آپ اسے کیا کہیں گے ؟ (تیسرا انعام : 40 رُوپے کی کتابیں)

4

فرحانہ عاشق (پتا نہیں لکھا)

13 اگست 1989ء کی شام کو ہمارے ماموں اور ممانی ہمارے گھر آئے ۔ امّی ابّو اُن کے ساتھ ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے ۔ اتنے میں ہمارے پسندیدہ ڈرامے کا وقت ہو گیا اور سارے گھر والے مہمانوں سمیت ٹی وی دیکھنے لگے ۔

اچانک مجھے پیاس لگی ۔ میں باورچی خانے میں پانی پینے کے لیے جانے لگی تو گیراج سے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی گاڑی کو

دھکیل کر باہر نکال رہا ہو ۔ جوں ہی میں گیراج میں داخل ہوئی ، میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا ۔ وہاں کالے رنگ کا نقاب پہنے ہوئے کوئی شخص کھڑا تھا ۔

اُسے دیکھ کر میں خوف زدہ ہوگئی مگر پھر اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے چور ۔۔۔ چور ۔۔ کا شور مچادیا ۔ چور کے ہاتھوں میں خلاف توقع کوئی ہتھیار نہیں تھا ، اس لیے مجھے حوصلہ ہوا اور اس خیال نے ڈھارس بندھائی کہ ماموں جان اور ابو جان ابھی آکر اسے پکڑ لیں گے ۔ اب چور دیوار پھلانگ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں مسلسل چیخے جارہی تھی ۔

اچانک چور نے واپس پلٹ کر میرے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور سرپٹ بھاگا ۔ لیکن گاڑی سے ٹکرا کر گر گیا۔ اسی لمحے سب گھر والے میری چیخیں سن کر باہر آگئے اور ماموں جان نے چور کو پکڑ لیا ۔ اس وقت تک تقریباً ساری گلی کے لوگ گھروں سے باہر آچکے تھے ۔ چور نے شور مچانا شروع کر دیا کہ وہ چور نہیں ہے ۔ بقول اس کے بچی کو غلط فہمی ہوگئی ہے ۔

اتنے میں گشتی پولیس بھی آگئی ۔ چور اتنی دیر میں اقرار کر چکا تھا کہ وہ پکا وارداتیا ہے اور اپنے ایک دوست کے ساتھ چوریاں کرتا ہے ۔ حال ہی میں اس نے 6 سائکلیں اور 3 موٹر سائکلیں چوری کرکے فروخت کی ہیں اور آج کار چوری کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پولیس نے اسے گرفتار کیا اور مجھے شاباش دی ۔

تمام لوگ میری بہادری اور ذہانت کی تعریف کر رہے تھے اور میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔

(چوتھا انعام : 35 روپے کی کتابیں)

5

صدف نواب ، سرگودھا

تقریباً سارے ہی بچے کوئی نہ کوئی کارنامہ انجام دیتے ہیں ، یہ اور بات ہے کہ بڑے ان کو کارنامہ نہیں مانتے ۔ اب دیکھیں نا سب سے آنکھ بچا کے کسی کے گھر سے جامن توڑ کر بخیریت واپس آنا بھی تو کارنامہ ہی ہے (جس پر ہمیشہ شاباش ملنے کے بجائے جوتے ہی پڑتے ہیں) سارا سال وڈیو کھیلنے کے بعد بھی کلاس میں اچھی پوزیشن سے پاس ہونا بھی کارنامہ ہی ہے ۔ سڑک پر ساری ٹریفک روک کر اپنی سائیکل نکال کر لے جانا بھی تو کارنامہ ہی ہے ۔ ویسے آپس کی بات ہے ۔ باجی سے تعلیم و تربیت کے لیے پیسے نکلوانا بھی ہم اپنا کارنامہ ہی سمجھتے ہیں ۔ کارنامے تو ہمارے ان گنت ہیں (اگر کوئی انہیں کارنامے مان لے تو) خیر ایک لکھے دیتے ہیں:

چند ماہ پہلے کی بات ہے عین دوپہر کے وقت ہم نے اسے دیوار پر چڑھے ہوئے دیکھا تھا ۔ ہم نے سب گھر والوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہم آگے بڑھے تو وہ دیوار سے چھلانگ لگا کر نیچے آگیا۔ ہمارا چہرہ غصّے سے سُرخ ہوگیا کہ اسے ہمارے گھر میں کُودنے کی جرأت کیسے ہوئی ۔ اور پھر ہمیں تو اس کی کئی دن سے تلاش تھی۔ کئی دن سے تاک میں تھے کہ اس چور کو پکڑ کر ہی چھوڑیں گے ۔

اُسے گھر کا صفایا کرتے دیکھ کر ہم آگے بڑھے تو اچانک صحن میں پڑے ہوئے گلاس پر پاؤں پڑا اور ہم لڑھکتے ہوئے اس کے قدموں میں جاگرے وہ ہوشیاری سے گلی کی طرف بھاگا لیکن ہم بھلا اسے کہاں چھوڑنے والے تھے ہم بھی اس کے پیچھے بھاگے اور گلی سے چوک تک ساڑھے سات چکر کاٹنے کے بعد اسے پکڑ ہی لیا اور پھر گھر لاکر سب کے سامنے کھڑا کر دیا وہ گردن جھکائے کھڑا تھا اور ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ اسے ابھی ذبح کر ڈالیں۔ کمینہ مرغا ! روز آکر ہمارے چوزوں کا دانہ کھا جاتا تھا ! (پانچواں انعام: 30 روپے کی کتابیں)

6

امبر گل کمال مصطفےٰ ، سرگودھا

کافی دنوں سے امّی بہت پریشان تھیں اور ان کی پریشانی کی وجہ ایک چوہا تھا ۔ جو کافی دنوں سے کچن میں اپنی من مانی کر رہا تھا ۔ امّی جو چیز بھی ہم سے چھپا کر الماری میں رکھتیں وہ لے اُڑتا ۔

امّی اور باجی روز اس کو مارنے کی ترکیبیں سوچتیں ۔ کئی دفعہ چوہے دان لگایا مگر وہ اس صفائی سے پنیر اور روٹی کا ٹکڑا لے اُڑتا کہ کچھ نہ پوچھیے ۔ اس نے امّی اور باجی کی ، جو کچن کی انچارج تھیں ، ناک میں دم کر رکھا تھا ۔

یہ چوہا اتنا پھُرتیلا تھا کہ لاکھ ڈنڈے مارو ، بریک ڈانس کرتا ہوا بھاگ جاتا تھا اور امّی اور باجی کو بھی خُوب بریک ڈانس کرواتا تھا ۔

آج جب میں اسکول سے گھر آئی تو امّی اور باجی ڈنڈے اور جوتے ہاتھ میں لیے اس کو مارنے کی کوشش کر رہی تھیں ۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے چور سپاہی کھیل رہی ہوں ۔ میری ہنسی تھی کہ قابو میں نہیں آرہی تھی ۔

آخر کار امّی نے اعلان کیا کہ جو کوئی اس چوہے کو مارے گا ، وہ اسے نیا فونٹین پن خرید کر دیں گی ۔ یہ سن کر پہلے باجی اٹھیں مگر

تھک ہار کر واپس لوٹ آئیں ۔ ان کے بعد بھیا جو اپنے آپ کو بروس لی سمجھتے تھے ، بڑی شان سے اُٹھے اور کہنے لگے کہ چوہا مارنا بھی کوئی بڑی بات ہے ۔ ابھی دیکھو میں اس کا بُھرکس نکال دوں گا ۔ وہ اب پوزیشن سنبھال چکے تھے ۔ یعنی ڈنڈا ہاتھ میں لیے بِل کے پاس کھڑے تھے کہ کب وہ نکلے اور کب اُس کی موت آئے ۔

خدا خدا کر کے چوہا باہر نکلا ۔ اس کے بعد وہ آگے آگے اور بھیا اس کے پیچھے پیچھے ۔ اس نے بروس لی بھیا کو تگنی کا ناچ نچا دیا ۔ آخر کار وہ برتنوں والی اونچی سی شیلف پر چڑھ گیا اور طنزیہ نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کہ رہا ہو ، بڑا آیا بروس لی ۔ ایک چوہا تو مار نہ سکا ۔ اتنے میں امی کا پارہ ہائی ہو گیا کہنے لگیں "بس کر بروسلی کے بچے ۔" اور بھیا کھسانی ہنسی ہنسنے لگے ۔

اب میری باری آئی ۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور ڈنڈا سنبھال کر دشمن پر وار کرنے کے لیے تیار ہو گئی ۔ پہلے پہل تو چوہے نے مجھے بھی خوب بریک ڈانس کروائے ۔ باجی بولیں ، بس کرو ۔ یہ منہ اور مسور کی دال ۔ جس چوہے کو ہم نہ مار سکے ، تم کیا مارو گی ۔ میں یہ سن کر غصّے سے لال پیلی ہو گئی اور پوری طاقت سے چوہے پر جھپٹی سارا کچن کباڑ خانہ نظر آنے لگا ۔

آہستہ آہستہ چوہا بے دم ہوتا گیا ۔ اسے کافی چوٹیں لگ چکی تھیں ۔ وہ میرے قدموں میں آکر گر پڑا ۔ میں نے فتح کا نعرہ لگایا اور کچن سے باہر نکل آئی ۔ اب تو امی میرے واری واری جا رہی تھیں ۔ اور بھیا اور باجی ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے ۔ امی نے رات کو میرا یہ کارنامہ ابو کو سُنایا اور مجھے ایک نیا شیفر پن انعام میں دیا ۔ (چھٹا انعام : 25 روپے کی کتابیں) ۔

7

عاصمہ صبوحی عصمی ، دینہ ضلع جہلم

یوں تو ہم نے بہت سے کارنامے کیے ہیں ، اور ان کارناموں پر ہمیں تمغے بھی ملے ہیں ، لیکن اس کارنامے پر ہمیں جو تمغہ ملا ہے وہ سب سے قیمتی ہے ۔ آئیے آپ کو اپنا کارنامہ سناؤں ۔

ایک دفعہ رات کو جب تقریباً سب ہی گھر والے سو چکے تھے اور میں سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ باہر سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی ۔ میں نے اس پر کوئی دھیان نہ دیا ۔ لیکن دوبارہ پھر ویسی ہی آواز آئی ۔ اب میری چھٹی حِس بیدار ہو گئی ۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی ہمارے اسٹور میں داخل ہو رہا ہے ۔ میں سمجھ گئی کہ یہ چور ہو گا ۔ پھر کیا تھا میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور ڈنڈا لے کر باہر نکلی ۔ جوں ہی میں نے ڈنڈا اس آدمی کے سر پر مارا وہ چیخ مار کر گر پڑا ۔ اسی وقت امی آگئیں اور انہوں نے وہی ڈنڈا میرے سر پہ دے مارا ۔

بات دراصل یہ تھی کہ جسے میں چور سمجھی تھی وہ بھائی جان تھے ، جو کسی کام سے لاہور گئے تھے اور ابھی ابھی واپس آئے تھے ۔ اس وقت وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اسٹور میں جا رہے تھے کہ ان کے سر پر ہم نے مولا بخش دے مارا ۔

(ساتواں انعام : 20 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار ادیبوں کی کہانیاں بھی اچھی ہیں ۔ ان کو 15،15 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں :

سردار علی ، مصری شاہ لاہور ۔ عدیل افضل ، اقبال ٹاؤن لاہور ۔ فقیہہ رضوی ، اقبال ٹاؤن لاہور ۔ عابد محمود قریشی ، گلشن راوی لاہور ۔ عادل اسماعیل، نرگس بلاک لاہور ۔ عظمیٰ ربانی ، ڈھولنوال لاہور ۔ خواجہ محمد صالح ، لاہور کینٹ ۔ کاشف ریاض ، شاہدرہ لاہور ۔ محمد عمران غوری ، باغبان پورہ لاہور ۔ فوزیہ رحمت ، رشید پورہ لاہور ۔ نادیہ عباس ، چوہان روڈ لاہور ۔ ثوریہ اشرف ، اچھرہ لاہور ۔ عدیل طارق ، اقبال ٹاؤن لاہور ۔ محمد فاروق سوڈی وال لاہور ۔ مصباح کرمانی ، لاہور ۔ محمد اُسامہ اقبال ، رحیم یار خان ۔ صغیر احمد ، سنجھور ۔ طارق رفیق بھٹی ، اوکاڑا ۔ مصباح سعید ، ساہیوال ۔ عمر حیات خان اعوان ، رحیم یار خان ۔ اقرار حسین جاوید ، شور کوٹ کینٹ ۔ توفیق سجاول ، اسلام آباد ۔ محمد ظفر ہاشمی ، اسلام آباد ۔ عمر بلال ، اسلام آباد ۔ ایوب خاں ، راولپنڈی ۔ ثروت ممتاز ، لال مارکیٹ کراچی ۔ سہیل الرحمان ، کراچی ۔ مجیب ظفر انوار ، کراچی 38 ۔ محمد الیاس ، شہیدِ مِلّت روڈ کراچی ۔ عدیل عارف ، گلشن اقبال کراچی ۔ عمران ذوالفقار علی، کلفٹن کراچی ۔ خالد عزیز ، نارتھ ناظم آباد کراچی ۔ نذیر احمد ، ملیر کراچی ۔ فریال وقار ، ناظم آباد کراچی ۔ محمد انیس الصادقین ، منگوپیر روڈ کراچی ۔ شاہانہ زرنس ناز ، حیدر آباد ۔ نجمہ حسینی ، حیدر آباد ۔ صابر فیاض ، حیدر آباد ۔ اعجاز احمد خٹک ، پشاور ۔ نعمان طارق ، پشاور ۔ آفتاب احمد ، پشاور کینٹ ۔ کامران طارق غزنوی ، پشاور ۔ اسد جعفر ، پشاور ۔ آصف اقبال ، پشاور ۔ نبیل احمد ، گل بہار پشاور ۔ محمد عارف ، کوئٹہ ۔ بلال بن علی ، کوئٹہ ۔ عبدالمالک سولنگی ، گڈو ۔ محمد فیصل حنیف ، پشاور ۔ اسد نعیم جنجوعہ ، راولپنڈی ۔

ہونہار مصوّر

ذوالفقار نواب، ملتان (پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)

اویس عزیز شیخ، فیصل آباد (دوسرا انعام 75 روپے کی کتابیں)

سیدہ کاشفہ خاتون نقوی، کراچی (تیسرا انعام 50 روپے کی کتابیں)

صداقت علی میرانی، سکھر (چوتھا انعام 25 روپے کی کتابیں)

صباحت منہاس، اقبال ٹاؤن لاہور (پانچواں انعام 20 روپے کی کتابیں)

بُشریٰ جبین، اسلام آباد (چھٹا انعام 15 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں:

محمد نعمان انجم، سرگودھا ۔ عادل شمسی، اِسلام آباد ۔ مُنیب اِدریس، راولپنڈی ۔ محمد کاشف اقبال، کوئٹہ ۔ ذیشان نائم، واہ کینٹ ۔ کبیر احمد، پشاور ۔ سعدیہ عباس، چوہان روڈ لاہور ۔ شاہد احمد، راولپنڈی ۔ محمد عاقب، راولپنڈی ۔ ابراہیم شیخ، حب چوکی لس بیلہ ۔ صائمہ محبوب الٰہی، ڈیرہ اسماعیل خان ۔ منزہ منیرہ راولپنڈی ۔ عمر خالد، لاہور کینٹ ۔ سیّد معین علی، راولپنڈی ۔ عاطف شہزاد، راولپنڈی ۔ محمد علی ٹیپو، اسلام آباد ۔ عمر حیات خان ، راولپنڈی ۔ ثاقب الحسن، غالب مارکیٹ لاہور ۔ پرنس مقصود الحسن، رضا آباد فیصل آباد ۔ کنول ریاض بٹ، راولپنڈی ۔ کاشف عزیز، نارتھ ناظم آباد کراچی ۔ شہزاد احمد، فیصل آباد ۔ عظمیٰ حاجی یونس، کراچی ۔

آپ ان موضوعات میں سے کسی موضوع پر چاہیں تصویر بنا سکتے ہیں

آخری تاریخ: 10 نومبر	دسمبر: پھول اور تتلی	جنوری: ہوائی جہاز

موٹر کار

امام یحییٰ زاہد

1712ء میں نیوکومن کے بھاپ انجن کی ایجاد کے بعد گھوڑا گاڑی کو بھاپ گاڑی کی شکل دینے کے لیے سخت کوششیں ہوئیں ۔ آخر کار "واٹ" کے انجن کو بہتر شکل دینے کے بعد یہ مسئلہ حل کر لیا گیا ۔ بھاپ کی قوت سے چلائی جانے والی پہلی گاڑی "نکولس کوگناٹ" نے 1769ء میں تیار کی۔ اس گاڑی کی ایجاد کے بعد تمام دُنیا میں کئی اقسام کی بھاپ سے چلنے والی گاڑیاں بنائی جانے لگیں ۔ 1820ء میں بہتر قسم کی بھاپ گاڑیاں ایجاد کر لی گئیں اور اُن گاڑیوں کے چلنے کے لیے پختہ سڑکیں تعمیر کی گئیں ۔

ابتدائی گاڑیاں پُرانی ڈاک گاڑیوں سے کافی مشابہت رکھتی تھیں اور اُسی طریقے سے مسافر اور سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی تھیں۔ یہ گاڑیاں 30 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی تھیں۔ تاہم 1865ء میں گاڑیوں کے لیے 4 میل فی گھنٹے کی رفتار مقرر کر دی گئی ۔ اس قانون سے گاڑیوں کی مزید ترقی میں رُکاوٹ پڑی۔

اُنیسویں صدی میں سائنس دانوں کا رُجحان ایسی ہلکی گاڑیاں بنانے کی طرف ہو گیا جنہیں آسانی کے ساتھ چلایا جا سکتا تھا۔ بھاپ گاڑی کے لیے ایک بہت بڑی اور وزنی انگیٹھی کی ضرورت ہوتی تھی جس میں کوئلا جلا کر بھاپ پیدا کی جاتی تھی۔ اس انگیٹھی کی وجہ سے گاڑی کو قدیم اسٹیم انجنوں کی طرح بہت بھاری وزن کھینچنا پڑتا تھا۔ تیل کی صنعت میں ترقّی کے بعد پٹرول اور پیرافین سے چلنے والی گاڑیاں ایجاد کر لی گئیں ۔ ان گاڑیوں میں بھاپ کی بجائے پٹرول کے جلنے کے عمل سے قُوت حاصل کی گئی ۔ اس قسم کے انجن کو انٹرنل کمبسچن (Internal Combustion Engine) کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے انجنوں میں پٹرول کے بُخارات ایک سلنڈر کے اندر جل کر پھیلتے ہیں جو کہ قوت پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں ۔

1860ء میں "ایٹائن لینائر" نے پہلا کامیاب گیس انجن تیار کیا۔ اس قسم کے انجن سے ایک جرمن سائنس دان این ۔ اے او ٹو نے 1876 میں چار اسٹروک والا طاقتور انجن تیار کر لیا۔

پٹرول سے چلنے والی دنیا کی پہلی کار 1885ء میں بنائی گئی ، 1889ء میں برطانیہ نے پٹرول سے چلنے والی کاریں درآمد کیں اور حدِ رفتار 4 میل فی گھنٹے سے بڑھا کر 12 میل فی گھنٹہ مقرر کر دی ۔

بیسویں صدی کے آغاز میں بھاپ سے چلنے والی مزید کاریں تیار کی گئیں۔ 1906ء میں امریکہ کے سٹینلے برادران نے پٹرول سے چلنے والی ایک ایسی کار تیار کی جو 127 میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ سکتی تھی ۔ اس قسم کی ہلکی اور تیز کاروں کے منظرِ عام پر آنے کے بعد بھاپ والی بھاری اور بھدّی کاریں غائب ہو گئیں کیونکہ اُن کی رفتار بہت سُست تھی۔

اس کے بعد پٹرول سے چلنے والی کاروں میں تبدیلیاں کر کے اُن کی کارکردگی کو بہتر بنا دیا گیا ۔ 1907ء میں سرہنری رائس نے مشہور کار "سلور گوسٹ" تیار کی۔ اس عرصے میں کار کی باڈی کو زیادہ مضبوط اور خُوب صورت بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ کار کی ساخت میں کئی اور مُفید چیزیں مثلاً وِنڈ سکرین ، کمانیاں اور وائپر وغیرہ کا اضافہ کر دیا گیا ۔

1930ء تک اس میدان میں اور بھی پیش رفت ہوئی اور ایسی کاریں تیار کر لی گئیں جن میں وینکل (Wankel) قسم کے انجن لگائے گئے ۔ گو وینکل انجن اور عام پٹرول انجن بُنیادی طور پر ایک ہی سسٹم کے تحت کام کرتے ہیں، لیکن وینکل انجن کا پِسٹن تکونی شکل کا ہوتا ہے جو ہوا اور پٹرول کے آمیزے کو سلنڈر میں ایک ساتھ دباتا ہے۔ اس کے علاوہ ان جدید کاروں میں آٹو میٹک گیئر لگائے گئے جو رفتار کے ساتھ خود بخود تبدیل ہو جاتے ہیں ۔

1891ء میں پہلی برقی کار منظرِ عام پر آئی ۔ یہ کار ایک ایسی بیٹری سے چلائی گئی جس کو تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد دوبارہ چارج کرنا پڑتا تھا۔ اسی وجہ سے یہ برقی کاریں زیادہ مقبول نہ ہو سکیں۔ جب پٹرول کاروں میں سیلف اسٹارٹ سسٹم لگایا گیا تو یہ برقی کاریں غائب ہو گئیں۔ تاہم سائنس دانوں کی برقی کاروں میں دل چسپی ختم نہیں ہوئی ۔ کیوں کہ یہ کاریں نہ تو دھواں چھوڑتی ہیں اور نہ اِن سے فضا کی آلودگی کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔

اب توقع کی جا رہی ہے کہ جدید قسم کی ایسی برقی بیٹریاں ایجاد کر لی جائیں گی جو گاڑیوں کو اتنے فاصلے تک لے جا سکیں گی جتنے فاصلے تک پٹرول سے بھری ہوئی ٹنکی لے جا سکتی ہے ۔

بچّہ جمورا

محمّد اقبال ثاقب

علی سرکس میں اپنے ابّو کے ہمراہ بازی گروں کے حیرت انگیز کرتب دیکھ کر بے حد لُطف اندوز ہو رہا تھا کہ اعلان ہُوا ۔

"خواتین و حضرات اب آپ کے سامنے ہمارے سرکس کے مایہ ناز فن کار اسلم پرنس صاحب سائیکل پر اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔"

اِس اعلان میں اسلم کا نام سُن کر علی کچھ چونک سا گیا۔ اعلان کے بعد سرکس کا سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان سُنہری رنگ کے چمکیلے اور چُست لباس میں ایک پہیئے والی اُونچی سائیکل پر نمودار ہوا۔ علی نے اسلم پرنس کے چہرے پر نظریں جمائی ہوئی تھیں۔

"ابّو ، دیکھیں تو ، یہ وہی بچّہ تو نہیں ہے جس کو بھائی جان نے بُہت مارا تھا اور آپ نے اُسے چُھڑا کر واپس بھیج دیا تھا۔" یہ سُن کر علی کے ابّو نے بھی ذہن پر کچھ زور دیا اور کہنے لگے "مگر بیٹا تم نے کیسے پہچان لیا؟"

"ابّو ، اس کا نام اسلم پرنس ہے اور اُس بچّے کا نام بھی اسلم تھا۔ گو اب یہ جوان ہو گیا ہے مگر میں نے اِس کے چہرے کے نقوش سے اندازہ لگایا ہے کہ یہ وہی لڑکا ہے" علی نے جواب دیا۔

باقی کا شو علی خاموشی سے دیکھتا رہا مگر وہ بے چین تھا کہ کب شو ختم ہو اور وہ اسلم سے مِلے ۔ خُدا خُدا کرکے شو ختم ہوا تو علی اور اُس کے ابّو سرکس کے منیجر کے پاس گئے ۔ ابّو نے منیجر سے اسلم پرنس کے بارے میں پوچھا اور اُس سے مِلنے کی خواہش کا اِظہار کیا۔ منیجر نے کہا کہ ہم اپنے فن کاروں سے عام آدمی کو مِلنے نہیں دیتے۔ لیکن اگر آپ یہ بتا دیں کہ آپ کس مقصد کے لیے اُن سے مِلنا چاہتے ہیں، تو آپ کی ملاقات کروائی جاسکتی ہے ۔ علی کے ابّو نے علی سے کہا کہ بیٹا تم خود ہی بتا دو کہ ہم اُن سے کیوں ملنا چاہتے ہیں

علی نے منیجر کو بتایا "آج سے تقریباً دس سال پہلے جب میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا تھا تو ایک روز اسکول سے چھٹی کے بعد پیدل گھر آ رہا تھا کہ سڑک پر ایک مداری نے تماشا شُروع کیا اور ڈُگ ڈُگی بجا کر کہنے لگا بچّہ جمورا ! کھڑا ہو جا!"

"ہو گیا" بچّے جمورے نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔

"آگ سے کھیلے گا؟" مداری نے پوچھا۔

"کھیلوں گا" جمورے نے جواب دیا۔

"تو پھر ہو جا تیار" یہ کہہ کر مداری نے تقریباً 4 فُٹ اونچا ایک گول چھلا جس کے اِرد گرد مٹّی کے تیل میں بھیگی ہُوئی کپڑے کی پٹّیاں لپٹی ہوئیں تھیں ، زمین میں گاڑ دیا۔ مداری نے ماچس نکال کر اُس چھلّے کو آگ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شُعلوں نے پورے چھلّے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ بچّے جمورے نے

جست لگائی اور بڑی مہارت سے آگ کے شعلوں کو چیرتا ہوا چھلّے میں سے گزر گیا۔

سرکس کا منیجر علی کی باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ علی نے اُسے بتایا کہ "آگ کے چھلّے میں سے گزرنے کے علاوہ بچّے جمورے نے اور بھی کافی کرتب دکھائے تھے۔ لیکن مداری کی جس آئٹم نے مجھے حیرت میں ڈال دیا وہ جمورے کی زبان کاٹنے کا آئٹم تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے سچ مُچ جمورے کی زبان کٹ گئی ہے کیوں کہ جمورے کے منہ سے خُون نکلنے لگا تھا۔

"ابھی اِس بات کو دو دِن ہی گزرے تھے کہ ہمارے گھر کے سامنے سے وہی بچّہ جمورا گزرا۔ میں نے اُسے روک کر پوچھا کہ تم وہی بچّے جمورے ہو جس نے دو روز پہلے تماشا دکھایا تھا۔ بچّے جمورے نے جواب دیا" ہاں بابُوجی ۔ میں وہی بچّہ جمورا ہوں۔" پھر میں نے پوچھا کہ یہ تو بتاؤ، اُس دِن مداری نے کیا سچ مُچ تمہاری زُبان کاٹ دی تھی؟ اِس پر جمورا مُسکرایا اور کہنے لگا کہ نہیں بابو جی یہ تو مداری کے ہاتھ کا کمال ہے۔

"میں جمورے کی باتیں سُن کر بُہت خُوش ہُوا۔ میں اُسے اپنے ڈرائینگ روم میں لے آیا۔ اُس کی اپنی عمر سے بڑی باتوں نے مجھے متاثر کیا۔ میں نے اُس کا نام پوچھا تو اُس نے اپنا نام اسلم بتایا۔ اُس نے مزید بتایا کہ ہماری جھونپڑی یہاں سے کچھ دُور گراؤنڈ میں ہے اور ہم شہروں شہروں گھومتے رہتے ہیں۔ جمورے کی یہ باتیں سُننے کے بعد میں اُس کے لیے شربت لینے چلا گیا۔ شربت پی کر وہ بُہت خُوش ہوا اور پھر چلا گیا۔

"تھوڑی دیر بعد میرے بڑے بھائی جان محسن ڈرائینگ روم میں آئے اور میز کی دراز میں سے اپنی گھڑی تلاش کرنے لگے۔ جب انہیں گھڑی نہ مِلی تو مُجھ سے پوچھنے لگے کہ یہاں دراز میں گھڑی تھی۔ تم نے تو نہیں اُٹھائی۔ میں نے جواب دیا "نہیں بھائی جان، مجھے تو کچھ عِلم نہیں۔" اِس کے بعد بھائی جان مُجھ سے پوچھا کہ ڈرائینگ روم میں کوئی اور تو نہیں آیا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ بچّہ جمورا آیا تھا۔ بھائی جان نے جھنجھلا کر پوچھا "کون بچّہ جمورا؟" میں نے بتایا کہ وہ بچّہ جمورا جو مداری کے ساتھ تماشا دکھاتا ہے۔ بھائی جان نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا "کیوں ایسے ویسے لوگوں کو گھر میں لے آتے ہو؟ اب وہ میری گھڑی چُرا کر لے گیا ہے بتاؤ کیا کریں؟" اُنہیں یقین تھا کہ گھڑی وہی بچہ جمورا اُٹھا کر لے گیا ہے۔ انہوں نے مُجھ سے کہا کہ جاؤ بچّے جمورے کو بُلا کر لاؤ۔

"جب میں جھونپڑی کے قریب پہنچا تو بچّہ جمورا بھاگ کر میرے پاس آگیا اور پوچھنے لگا "بابو جی، آپ ہمارے گھر کیسے آ گئے؟" میں نے اُسے بتایا کہ میرے بڑے بھائی جان تم سے مِلنا چاہتے ہیں۔ بچّے جمورے نے اپنی بوڑھی والدہ سے کہا کہ میں کہیں جا رہا ہوں۔ کچھ دیر بعد واپس آجاؤں گا۔

"یہ کہ کر بچّہ جمورا میرے ساتھ ہو لیا اور ہم دونوں گھر آ گئے۔ بھائی جان نے گھڑی کے بارے میں اُس سے پوچھا تو اُس نے سہم کر جواب دیا "بابو جی، چوری کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

بھائی جان کو غُصّہ آگیا۔ وہ کہنے لگے "تو ایسے نہیں مانے گا۔" یہ کہ کر اُنہوں نے بچّے جمورے کو مارنا شروع کر دیا۔ مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا کہ جس ڈرائینگ روم میں یہ بے چارہ شربت پی کر خُوش ہو رہا تھا، اُسی میں مار کھا رہا ہے۔

اتنے میں ابُّو جان آگئے اور میں نے انہیں ساری بات بتائی۔ انہوں نے جمورے کو بھائی جان سے چُھڑا کر واپس بھیج دیا اور بھائی جان کو ڈانٹا کہ بغیر ثبوت کے ایک معصوم بچّے کو کیوں مار رہے تھے؟

اس واقعے کو گُزرے دو ہی دِن ہوئے تھے کہ بھائی جان کی گھڑی اُن کی کتابوں والی الماری سے مِل گئی۔ بھائی جان اپنے کیے پر بُہت شرمندہ تھے۔ ابُّو نے مجھے اور بھائی جان سے کہا کہ جاؤ، بچّے جمورے سے معافی مانگ کر آؤ۔ لیکن جب میں اور بھائی جان اُس گراؤنڈ میں پہنچے تو جمورے کی جھونپڑی غائب تھی اور وہ لوگ کہیں اور جا چکے تھے۔

سرکس کے منیجر علی کی باتیں سُننے کے بعد بولے "ہاں، علی بیٹا۔ تُم نے خُوب پہچانا۔ یہ وہی بچّہ جمورا اسلم ہے جو ہماری کمپنی میں اسلم پرنس کے نام سے مشہور ہے۔

یہ کہ کر منیجر نے اسلم پرنس کو بُلایا۔ علی نے اسے دیکھتے ہی گلے لگا لیا اور گھڑی والی بات بتائی تو اُسے سب کچھ یاد آگیا۔ علی کے والد نے بھی اسلم سے ہاتھ مِلایا اور کہا:

"بیٹا، میں بُہت شرمندہ ہُوں کہ میرے بڑے بیٹے مُحسن نے تمہارے ساتھ زیادتی کی۔ میں اُسے آج ہی تمہارے پاس لاؤں گا تاکہ وہ تم سے معافی مانگے۔"

یہ سُن کر اسلم بولا "کوئی بات نہیں، انکل۔ بچّوں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں اور معاف کرنا ہمارے پیارے نبی کی سُنّت ہے۔"

جنّت کی وادی

سوات

فضلِ ربی راہی

سوات کی وادی اپنے حُسن و جمال اور دل کشی کے لئے پوری دُنیا میں مشہور ہے۔ یہاں کی فضائیں دل کش، ہوائیں مُعطّر اور ہر وادی اور ہر علاقہ سر سبز و شاداب ہے۔ یہاں کے برف کی چادر میں لپٹے ہوئے پہاڑ، گُن گناتے آب شار، میٹھے اور شفّاف چشمے، صِحّت بخش آب و ہوا اور رنگین نظارے انسان کا دل موہ لیتے ہیں۔

سوات جہاں حُسن و دل کشی کا حسین مُرقّع ہے وہاں تاریخی اعتبار سے بھی بڑی اہمیّت کا حامِل ہے۔ قدیم زمانے میں یہ اپنی خوب صورتی اور شادابی کی وجہ سے بہت سے حملہ آوروں کا شکار رہ چکا ہے۔ لیکن یہاں کے رہنے والوں نے ہر دور میں غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دی ہے اور کسی بھی دور میں کسی کا غلام بننا قبول نہیں کیا۔ اس سرزمین نے بہت سے قابل جرنیلوں اور مشہور شخصیات کو بھی جنم دیا ہے۔

سوات کے شِمال میں چترال، جنُوب میں ضلع مردان، مغرب میں دیر اور مشرق میں سابق ریاست امب کا علاقہ ہے۔ قدیم کتابوں میں سوات کا ذکر "اودیانہ" کے نام سے آیا ہے۔ یہ سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "گلستان"۔ یونانیوں نے جو سکندرِ اعظم کے ساتھ آئے تھے، اپنی تحریروں میں دریائے سوات کو "سواستو" لکھا ہے جس کے معنی ہیں سفید پانی۔

دریائے سوات یہاں کا سب سے بڑا دریا ہے جو شمال سے جنُوب کو بہتا ہے۔ کئی چھوٹے بڑے ندی نالے راستے میں اس سے ملتے چلے جاتے ہیں۔ سردی کے موسم میں یہاں خوب برف باری ہوتی ہے۔ اِرد گرد کے پہاڑ برف سے ڈھک جاتے ہیں۔ برف کی سفید چادر ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے۔ گرمیوں میں جب برف پگھلتی ہے تو پُوری وادی دُھل جاتی ہے، موسم خوش گوار ہو جاتا ہے، درختوں کو نئی زندگی ملتی ہے اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ رنگ برنگ پُھول ذہن کو آسُودگی اور دل کو راحت بخشتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں مُلکی اور غیر مُلکی سیّاح سیر کے لیے یہاں آتے ہیں۔

یہاں کے قابلِ دید مقامات میں منگورہ، مَرغ زار، مدین، بحرین، کالام اور ملم جبہ زیادہ مشہور ہیں۔ کالام سے چند کلو میٹر شمال میں ایک خوب صُورت جھیل ہے جسے مہوڈنڈ (مچھلیوں کا تالاب) کہتے ہیں۔ یہ جھیل حُسن و دل کشی میں اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن پُختہ سڑک نہ ہونے کی وجہ سے اس کا راستہ پیدل ہی طے کرنا پڑتا ہے جو کافی دُشوار گزار ہے۔ اب ہم آپ کو سوات کے مشہور مقامات کی سیر کراتے ہیں۔

منگورہ: منگورہ سوات کا سب سے بڑا تجارتی اور مرکزی شہر ہے۔ اس کے بازار مقامی اور غیر مقامی اشیا سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ شہر قدیم زمانے میں بُدھ مت کا ایک روحانی اور تاریخی شہر رہا ہے، جس کا ثبوت یہاں کے بٹ کڑہ کے مقام سے برآمد شدہ آثار سے ملتا ہے۔

منگورہ بلند پہاڑوں میں گھرا ہوا ایک خوب صُورت اور صاف سُتھرا شہر ہے اور دریائے سوات کے کنارے آباد ہے ۔ اس کے قُرب و جوار میں سیّاحوں کے لئے بہت سے دل کش اور پُر فضا مقامات موجود ہیں۔ جن میں سیدو شریف (جو منگورہ سے صرف 2 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے) خصوصی اہمیّت رکھتا ہے۔ منگورہ سے تقریباً 2 کلو میٹر کے فاصلے پر مشرق کی طرف مدین، بحرین روڈ پر فضاگٹ میں ایک خُوب صُورت پارک ہے۔ اس کے دونوں جانب دریائے سوات سے نکلی ہوئی صاف و شفاف ندیاں بہہ رہی ہیں۔ ان کے بیچ میں ایک خُوب صُورت پارک ہے۔ ندیوں سے نکالی گئی نالیاں پارک کے اندرونی حصّے میں بہتی ہیں اور ان کے ساتھ

فضاگٹ پارک کا ایک منظر

پھولوں کی بھینی بھینی مہک شامل ہوتی ہے تو انسان پر کیف و سرور طاری ہو جاتا ہے۔ یہاں ہر وقت ملکی و غیر ملکی سیاحوں اور مقامی لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے ۔

مَرغزار: مَرغ زار ایک سرسبز و شاداب مگر تنگ سی وادی ہے اور قُدرت کی رعنائیوں سے بھرپُور ہے۔ یہ مقام سوات کے مرکزی شہر منگورہ سے 14 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے اور پکی سڑک کے ذریعے ، جنوب کی طرف سے، سیدو شریف اور منگورہ سے ملا ہُوا ہے۔ پُورا راستہ دونوں طرف سے اخروٹ کے درختوں میں گھرا ہوا ہے۔

مرغزار نہ صرف اپنے اچھوتے حُسن بلکہ معدنی وسائل کے سبب بھی شُہرت رکھتا ہے۔ یہاں کے پہاڑوں میں سنگِ مرمر کی کئی نادر اقسام ملتی ہیں۔ یہاں ایک تاریخی محل بھی ہے جو سفید محل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ محل میاں گل عبدالودود بانئ سوات (بادشاہ صاحب) نے تعمیر کروایا تھا ۔ یہ اُن کا گرمائی صدر مقام تھا اور اب ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا ہے ۔ بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں پھلوں سے لدے پھندے درخت حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

مدین: مدین منگورہ سے تقریباً 50 کلو میٹر کے فاصلے پر دریائے سوات کے کنارے واقع ہے ۔ یہ پکی سڑک کے ذریعے منگورہ اور سیدو شریف سے ملا ہوا ہے اور تینوں طرف سے فلک بوس پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے جو جنگلات سے بھرے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اس وادی کا رُخ کرتے ہیں ، یہاں کے دل فریب مناظر دیکھ کر اُن کا دل واپس جانے کو نہیں چاہتا ۔ شہر کے ہنگاموں سے اُکتائے ہوئے لوگوں کے لئے یہ وادی سکون و راحت کا بہترین مرکز

ملکوہ کا ایک منظر

ہے۔ یہاں سیاحوں کے لئے بہت سی سہولتیں موجود ہیں اور سڑک کی حالت بھی کافی بہتر ہے ۔ یہاں ایک بارونق بازار ہے جس میں ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز باآسانی ملتی ہے اس کے علاوہ کئی خوب صورت ہوٹل بھی ہیں۔ ٹراؤٹ مچھلیوں کا ایک فارم بھی ہے جو چیل روڈ پر واقع ہے ۔

چیل : مدین سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی جگہ "چیل" ہے جو در حقیقت فردوس بریں کا منظر پیش کرتی ہے۔ یہاں آکر انسان کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ جنّت کے پُر سکون اور خوب صورت باغ میں گھوم رہا ہو ۔ پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی چیل کی سڑک بہت خُوب صُورت لگتی ہے۔ سڑک کے ساتھ بہتی ہُوئی مُنہ زور ندی اور اس کے کنارے کِھلے ہوئے خُوب صُورت پُھول پوری وادی کی فضا کو مُعطّر کر دیتے ہیں ۔ مدین آکر اگر چیل کو نہ دیکھا جائے تو مدین کی سیر ادھوری رہ جاتی ہے ۔ (باقی اگلے شمارے میں)

دانہ گیر

نر کا سر اور چوٹی سیاہ، چہرے کی کھال سُرخ ، حلق جامنی نیلا ، گردن سُرخ ، سینہ شوخ نارنجی ، اُوپر کا حصّہ سلیٹی اور سیاہ اور دُم کا سرا سیاہ ہوتا ہے۔

عمودی چٹانوں پر جھاڑیوں اور کُھلے جنگلات ، ڈھلانوں پر اُگے جنگلات اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر 300 میٹر سے 400 میٹر کی بلندی تک ہزارہ، کوہستان ، وادیٔ کاغان اور آزاد کشمیر میں پایا جاتا ہے۔

عام طور پر جوڑا جوڑا یا چھوٹی ٹولیوں میں ملتا ہے۔ صُبح کے وقت اور شام ڈھلے کھلی جگہوں اور جھاڑیوں کے درمیان راستوں میں نظر آجاتا ہے۔ باقی تمام وقت جھاڑیوں میں چھپا رہتا ہے۔

رات کو درخت پر بسیرا کرتا ہے ۔ اس کی آواز ہلکی سے شروع ہو کر بلند ہوتی جاتی ہے اور کوا کوا، کاہوا، کلواہ ، کواہ جیسی ہوتی ہے ۔ بیج ، جڑیں ، نرم پتّے اور پھل اور کیڑے مکوڑے کھاتا ہے۔

یہ پرندے مئی اور جون میں نسل کشی کرتے ہیں۔ گھونسلہ زمین پر جھاڑی تلے یا کسی چھوٹے درخت میں بناتے ہیں۔ مادہ تین سے چھ انڈے دیتی ہے ۔ انڈوں کا رنگ سُرخی مائل بُھورا ہوتا ہے اور ان پر گہرے بُھورے رنگ کی چھوٹی چھوٹی لکیریں ہوتی ہیں ۔ 28 دِن میں انڈوں میں سے بچّے نکل آتے ہیں ۔

(ایم ۔ آئی ۔ بیگ)

جنگلی حیات قومی ورثہ ہے

اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔